لکھنؤ
تعمیرِ حیات
پندرہ روزہ

وہ ایک نشانِ منزل تھے۔

کل اخبار میں مولانا عبدالماجد صاحب مرحوم و مغفور کے سانحۂ رحلت کی خبر پڑھی۔ مرحوم کی وفات سے کتنی وہ طویل، قیمتی اور نوع بہ نوع خدمات کی یاد تازہ ہو گئی، جن پر مرحوم کی گرانقدر شخصیت اثر انداز رہی تھی۔ مذہب اور اخلاق، ادب و تنقید، معاشرت و صحافت کی کونسی وادیاں نہ تھیں جن سے مرحوم خوش، خاموشی، سنجیدگی اور قابلیت سے نہیں گزر چکے تھے۔ گزشتہ نصف صدی سے اوپر مرحوم کو جو طویل اور زریں زمانہ ہمارے نواح کی جیسی جلیل و عظیم شخصیتوں سے متاثر ہونے اور متاثر کرنے کا ملا وہ شاید اب کسی کو نصیب نہ ہو۔ وہ ایک نشانِ منزل تھے جس کو انہوں نے ہمارے علم و دانش اور تہذیب و ثقافت کے راستہ میں بہت دور تک لاکر نصب کر دیا تھا۔ مرحوم کی علمی، مذہبی، ادبی اور اخلاقی خدمات کی تفصیل پیش کرنا ابھی تو کیا بہت دنوں تک ناممکن رہے گا۔ مرحوم و مغفور اب وہاں پہنچ چکے ہیں جہاں ان کا معاملہ اللہ جل شانہٗ کے ساتھ ہے۔ لیکن ہماری ذمہ داری بھی کچھ نہیں کہ مرحوم کی دینوی خدمات کا تفصیلی اور بطریقِ احسن جائزہ لیں تاکہ وہ آئندہ نسلوں کی رہبری اور ہمت افزائی میں معاون ہو۔ یہ سطور لکھ رہا تھا کہ محسوس ہوا جیسے دریاباد تاریخی اعتبار سے جیسا کچھ ہو۔ اب مرحوم ہی کے نام سے وابستہ ہو گیا ہے! یہ امتیاز اس صدی میں اور ہمارے ہی دیار کے کسی اور کے حصہ میں شاید ہی آیا ہو! اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے، اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین

آپ کے غم کا شریک
(پروفیسر) رشید احمد صدیقی

قیمت: ۱/۵۰

اشاعتِ خاص

Regd No. LW/NP 56
Phone: 22345 / 29747
TAMEER-E-HAYAT
Fortnightly
(NADWATUL-ULAMA LUCKNOW-226007 (INDIA)
SARFRAZ

مجمع بحار الانوار
(احادیث کی مشکلات حل کرنے کے لئے بے نظیر کتاب)

تالیف:- ملک المحدثین علامہ شیخ محمد طاہر پٹنی گجراتی (المتوفی ۹۸۶ھ)
اس کتاب کے بارے میں تمام دنیا کے علماء اور ماہرینِ فنِ حدیث کا اتفاق ہے کہ یہ اپنے موضوع پر منفرد اور بے نظیر ہے، جو اپنی جامعیت اور فنی رعایتوں کے اعتبار سے اس موضوع پر لکھی گئی تمام کتابوں سے فائق ہے۔ الفاظ حدیث بالخصوص صحاح ستہ کی لغوی مشکلات اور دیگر مباحث کے لئے یہ کتاب گویا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ جس میں لغوی تحقیق اور فنی بحثیں ایسی مبسوط اور مدلل طریقہ پر کی گئی ہیں جو طالبِ علم کو دوسری کتابوں سے بے نیاز کر دیتی ہے اور احادیث کے مرجع کی نشاندہی بھی ہو جاتی ہے۔
ہندوستان ہی نہیں بلادِ عربیہ کے علماء نے بھی اس کی عظمت اور اہمیت کا غیر معمولی اعتراف کیا ہے۔

یہ کتاب عرصہ سے نایاب تھی، قدر دانوں کی طلب بلکہ ان کے اصرار پر اب خدا کا شکر ہے کہ نہایت آب و تاب اور عربی ٹائپ کی دیدہ زیب طباعت کے ساتھ اچھے کاغذ پر۔ پہلی بار۔ محدثِ شہیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی مدظلہ کے گرانقدر مقدمہ اور محققِ لغات مولانا عبدالحفیظ بلیاوی کی تصحیح و تنقیح کے بعد۔ ۵ جلدوں میں، دائرۃ المعارف حیدرآباد نے طبع کرکے اہلِ علم کی دیرینہ آرزو پوری کردی ہے۔
کتاب کے مجموعی صفحات سے سوا تین ہزار سے زیادہ ہونے کے باوجود۔ نفعِ عام اور علمِ دین کی خدمت کے جذبہ سے۔ پورا سیٹ لینے والوں کے لئے اس کا ہدیہ صرف ڈیڑھ سو (۱۵۰) روپئے رکھا گیا ہے۔

ہندوستان میں
مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء پوسٹ بکس ۹۳ لکھنؤ
سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

جعلی لیبل، نقلی کیپسول اور ٹین کے ڈھکن سے ہوشیار!

نورانی تیل
درد۔ زخم۔ چوٹ۔ جلنے۔ کٹنے کی دوا۔
اب سنہرے اور ہرے دو رنگے کیپسول پر ٹریڈ مارک دیکھ کر خریدیئے۔

انڈین کیمیکل کمپنی مئوناتھ بھنجن یوپی

ہند تیل
ہر قسم کے جسمانی۔ درد۔ چوٹ۔ زخم۔ موچ جلنے۔ کٹنے وغیرہ جیسے گھریلو حادثہ کا فوری علاج ہے۔ اس کی مسلسل مالش کرو بچوں کو تندرست و توانا بناتی ہے
تیار کردہ:- ہند سی۔ سی ورکس۔ مئوناتھ بھنجن یوپی

"تعمیرِ حیات"
میں
اشتہار
دیکر
اپنی تجارت
کو
فروغ
دیجئے

شربت نزلہ
معمولی
کھانسی، زکام
اور نزلہ کے لئے
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

تار کا پتہ مجموعہ بمبئی — ٹیلیفون نمبر ۳۳۳۸۲۵

عطر مجموعہ نمبر ۳۹۱۸
دل پسند خوشبوؤں کا نچوڑ
ہندستان کا عطر مجموعہ سعید پاک خوشبوؤں اور تجربے کاروں کے لئے ایک تحفہ شادی بیاہ اور خوشی کی تقریبات کے لئے ایک خاص ہدیہ ہے۔ مجموعوں اور دینی جماعت کا سنگھار ہے نقلی مال سے ہوشیار رہیں۔
خریدنے سے پہلے نمبر ۳۹۱۸ ضرور دیکھئے۔
پتہ: حافظ محمد زکریا برادران تاجران عطر و تیل ۲۰ الطیبہ جمالی بلڈنگ روڈ بمبئی ۳

بہترین چائے کا قابلِ اعتماد مرکز
عباس علاء الدین اینڈ کمپنی
نمبر ۱۴۹ حاجی بلڈنگ (ایس وی ڈی روڈ)
بن بازار بمبئی نمبر ۴

اسپیشل مکسچر	کپ برانڈ
اسپیشل ممری	گولڈن ڈسٹ
نوبل مکسچر	فلاوری او پی

TELEGRAM:-
CUP, KATTLY
PHONE No 332220

نرخِ اشتراک اندرونِ ہند مع محصول ڈاک:
سالانہ: ۱۲ روپے ششماہی سات روپے
فی پرچہ: ۶۰ پیسے
بیرونِ ہند مع محصول ڈاک:
بحری ڈاک سے: ایک پاؤنڈ شلنگ
ہوائی ڈاک سے، امریکہ و کناڈا اور یورپین ممالک: ۳ پونڈ
افریقہ، مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کے ممالک ۲½ پونڈ
پاکستان: ۳۰ روپے
بنگلہ دیش: ۱۵ روپے

تعمیرِ حیات

لکھنؤ

پندرہ روزہ

شعبۂ تعمیر و ترقی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جلد ۱۴ | ۱۰ و ۲۵ جنوری و ۱۰ فروری ۱۹۷۷ء | ۱۹ محرم الحرام ۳ و ۲۰ صفر ۱۳۹۷ھ | شمارہ ۵، ۶، ۷

اسحٰق جلیس ندوی

مولانا عبدالماجد دریابادی ——— ایک دور کا خاتمہ

۶ جنوری کی صبح مفسرِ قرآن، صاحب اسلوب ادیب، انشاء پرداز، مصنف و محقق، ممتاز صحافی اور ندوۃ العلماء کے مجلس انتظامی کے صدر نشین مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کہیں پڑھا ہے کہ جو لوگ زندگی کا تعاقب کرتے ہیں وہ قحط سے زیادہ قحط رجال کا ماتم کرتے ہیں اس دورِ قحط رجال میں ایک ایسی شخصیت سے محرومی جس کے ساتھ ایک عہد ختم ہو گیا ایک عظیم سانحہ ہے۔

مولانا دریابادیؒ کی معاصر شخصیتوں میں برصغیر ہند و پاک میں اب کوئی ایسی شخصیت نہیں جسے علمی دنیا میں اعتبار اور اردو ادب کی بارگاہ میں سند کا درجہ حاصل ہو۔ جس کے مضامین اور انشاء کے نمونے اردو زبان و ادب کی کتابوں میں کالج اور یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہوں اور جس کی تفسیر اور علمی و دینی تصنیفات سے علماء اور دینی مدارس کے طلباء مستفید ہوں ——— جس کے ہفت روزہ اخبار کا انتظار ہر مسلک و خیال ہر مکتب فکر کے لوگوں کو یکساں ہو۔ ؏

اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی پیدائش اس زمانہ میں ہوئی جب ہندوستان میں ایک ایسے نئے دور کا آغاز ہو رہا تھا جس میں قدیم تہذیب، پرانی قدریں اور دیرینہ روایات کمزور پڑ رہی تھیں۔ نیا سیاسی اور سماجی نظام بن رہا تھا اور پرانا ڈھانچہ دم توڑ رہا تھا۔ سیاسی بالادستی کے ساتھ مغربی فلسفہ، مغربی معاشرت، مغربی زبان و تہذیب، مغربی ادب و لٹریچر اور مغرب کی تحقیقات و ایجادات، انکشافات اور انکشافات سے مرعوبیت کے آثار پورے شرق پر نمایاں تھے اس قدیم نظام تعلیم کی بساط لپیٹ دی گئی تھی جو اس ملک کی قدیم روایات، مذہبی اقدار اور تہذیب و ثقافت سے ہم آہنگ تھا اور ایک ایسے نئے نظام تعلیم کی آبیاری ہو رہی تھی جس کا مقصد انگریزی نظام حکومت کو وفادار اور ارزاں انتظامیہ فراہم کرنا تھا۔

مولانا دریابادی اسی نظام تعلیم کی آغوش میں پلے بڑھے اور پروان چڑھے انہوں نے اس زمانہ میں بی۔ اے کیا جب اس ڈگری کی نقد قیمت ڈپٹی کلکٹری کی شکل میں مل جاتی تھی، لیکن اپنے علمی شغف، ذوقِ تحقیق و مطالعہ نے انہیں اسی میدان میں خوب سے خوب تر کی تلاش میں مجبور کیا ——— زمانۂ طالب علمی سے انہوں نے مضمون نگاری شروع کی فلسفہ اور نفسیات کی موضوعات پر مضامین اور کتابوں کے تراجم کے ذریعہ وہ علمی اور ادبی حلقوں میں معروف و متعارف ہوئے۔

مولانا کی زندگی میں ایک نازک مرحلہ اس وقت آیا جب کہ ان کی ذہانت اور مغربی مصنفین کی کتابوں کے مطالعہ نے انہیں خدا کے وجود اور دین و مذہب کے بارے میں شک و تشکیک میں مبتلا کر دیا وہ عرصہ تک اپنے کو ناستک کہلانے اور سمجھنے پر فخر محسوس کرتے رہے اس نازک مرحلہ میں توفیق الٰہی نے انہیں بعض ایسی شخصیتوں سے قریب کر دیا جنہوں نے بڑی حکمت سے انہیں اس دلدل سے نکالا ان میں سرفہرست اکبر الٰہ آبادی کی ہے جنہوں نے ادبی ذوق کے حامل اور فلسفہ و نفسیات کے ایک ذہین طالب علم اور فاضل کی اصلاح بالکل نفسیاتی انداز میں کی۔ انہوں نے مولانا دریابادی کو مشورہ دیا کہ وہ قرآن مجید کا مطالعہ خالص ادبی نقطۂ نظر سے کریں اور جس آیت سے متاثر ہوں اس پر غور و فکر کریں اکبر الٰہ آبادی کے اس مشورہ نے مولانا دریابادی کو اس "الکتاب" سے متاثر کیا جسے وہ وحی الٰہی کے بجائے رسول عربیؐ کا کلام سمجھتے تھے۔ قرآن مجید کی حقانیت اور اس کے اعجاز کے وہ اس درجہ گرویدہ ہو گئے کہ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اور قیمتی وقت اسی کی خدمت میں صرف کیا۔ اکبر الٰہ آبادی کے بعد مولانا محمد علی جوہر نے مولانا دریابادی کی شخصیت کی دینی تعمیر و تشکیل میں زبردست کردار ادا کیا۔ مولانا دریابادی کی انگریزی کتاب "سائیکالوجی آف لیڈرشپ" پر (جو لندن میں چھپی اور ہندوستان کے یونیورسٹیوں کے نصاب میں عرصہ تک داخل رہی) مولانا محمد علی جوہر کے مفصل تبصرہ سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

فلسفہ اور نفسیات کے اس عقلیت گزیدہ نوجوان کو الحاد و دہریت کی ڈگر سے ایمان و اسلام کی شاہراہ پر گامزن کرنے میں مولانا روم کی مثنوی جس کے متعلق رومیؒ نے خود کہا ہے۔ ؏

ہست قرآں در زبانِ پہلوی

اور مکتوبات مجدد الف ثانیؒ کا نمایاں حصہ ہے۔ مولانا دریابادی نے ان کتابوں کو اپنی محسن کتابوں میں سرفہرست لکھا ہے۔

مولانا دریابادی کی زندگی کا یہ انقلاب ہمہ جہتی انقلاب تھا۔ قلب کے ساتھ قالب بھی بدلا مسٹر عبدالماجد بی۔ اے مولانا عبدالماجد دریابادی کہلائے۔ چہرہ سنت رسول سے پرنور اور جسم عبا اور کھدر کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں مشرقی اور اسلامی سادگی کا نمونہ۔ بزرگوں، محسنوں اور احباب کی فہرست میں لسان العصر اکبر الٰہ آبادی، مولانا محمد علی جوہر، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا حسین احمد مدنی (جن سے بیعت کا بھی تعلق تھا)، مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبدالباری ندوی جیسی علمی اور دینی شخصیتیں، اور علم و ادب کی خدمت دین کا دفاع، مغربی افکار و نظریات پر طنز و نشتر رات دن کا مشغلہ۔

مولانا دریابادی نے مولانا محمد علی جوہر کے اثر سے جن کے وہ بڑے معتقد قائل بلکہ عاشق تھے ایک زمانہ میں سیاست اور اجتماعی خدمت کی وادیٔ پرخار میں بھی قدم رکھا تھا۔ لیکن جلد ہی وہ اس سے کنارہ کش ہو گئے اور ایک گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر پوری یکسوئی کے ساتھ انہوں نے علم و ادب کے دامن کو مالا مال کیا۔

مولانا دریابادیؒ کی زندگی بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مجموعۂ کمالات بلکہ مجموعۂ اضداد تھی۔ ان کی زندگی کا اک دور تو وہ تھا جس میں وہ پکے ریشنلسٹ نظر آتے ہیں، کبھی وہ مسز اینی بیسنٹ کی تحریک سے متاثر اور تھیوسوفیکل سوسائٹی کے رکن ہیں۔ علم و ادب کے میدان میں وہ "فلسفۂ اجتماع" کے مصنف اور لیکی کی "تاریخ اخلاق یورپ" کے مترجم ہیں ——— مرزا رسوا کے ناول امراؤ جان ادا پر تبصرہ کرکے ادبی دنیا میں اسے روشناس کراتے ہیں۔ الناظر اور ہمدرد کے کالم نگار، مولانا آزاد کے ہفت روزہ "الہلال" میں "حظ و کرب" کی ایسی طویل بحث چھیڑنے والے جس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے ——— نفسیات فلسفہ، ادب، دینیات اور مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ ایسے متنوع اور متضاد موضوعات پر انہوں نے لکھا اور اہل علم سے ان سب میں اپنی انفرادیت کا لوہا منوا لیا۔

تیرے ہر نقطہ میں پنہاں "صدق" کا پیغام ہے!

اے مفسر! اے محقق!! اے خطیبِ خوش بیاں!
اے مفکر! اے مبصر!! اے وطن کے پاسباں!
اے ادیبِ ایشیا! اے نازشِ ہندوستاں!
اے کہ تیری ذات ہے، سرمایۂ صد افتخار!
تیری عظمت سے کوئی، انکار کر سکتا نہیں!
تیرا اک اک حرف ہے علم و ادب کا شاہکار
تو نے سچائی کو بخشی ہے حیاتِ پائیدار
علم و فن کی تو نے خدمت کی ہے ستر سال تک
تو نے فنِ "نقد"، کو بخشی وہ معراجِ کمال!
سانس لیتا ہے اسی دنیائے آب و گِل میں تو!
تیری ہر "تحریر" ہے مہر و محبت کی کتاب!
تیری ہر "تصنیف" "حکمت" کا چھلکتا جام ہے!
تیرے ہر نقطہ میں پنہاں "صدق"، کا پیغام ہے!
تلخ تر کوئی حقیقت، تجھ سے پوشیدہ نہیں!
نظم تدبیر سیاست، میں ہے "گمراہی" ہنوز!
دور کرنا چاہتا ہے دہر سے "بغض و عناد"
کس قدر لطف بیاں ہے کس قدر سوز و گداز
تجھ کو دنیا کی خبر ہستی کا ہے عرفان بھی
دیکھتا ہے "عالم ایجاد" کی ہر واردات
کارناموں کو ترے دنیا بھلا سکتی نہیں

اے جلیل القدر ناقد! اے حکیم نکتہ داں!
اے عظیم المرتبت! اے قوم کے روحِ رواں!
طول و عرضِ ملک میں لاکھوں ہیں تیرے قدرداں!
رشک کے قابل ہے تیرا خامۂ معجز نگار
کوئی "سورج" کو پسِ دیوار کر سکتا نہیں
تیرے ہی دم سے ہے قائم آج "اردو" کا وقار
ناز فرماتی ہے جس پر "رحمتِ پروردگار"
تیرے مداحوں میں تھے آزاد اور اقبال تک
جس کو کہہ سکتے ہیں، اربابِ بصیرت "لازوال"
باتیں، یوں کرتا ہے گویا ہے ہمارے دل میں تو
تیرا ہر اک "لفظ" ہے گویا "صداقت" کا رباب
"مجتہد ہے"، ندرتِ اسلوب تیرا کام ہے!
ذہن تیرا واقعی "گہوارۂ الہام" ہے!
تجھ کو فطرت نے عطا کی ہے "نگاہِ دوربین"
"امن" کی منزل سے ہیں ناآشنا "راہی" ہنوز!
تیرا نعرہ "اتحاد و اتحاد و اتحاد"!
ہیں تری "تحریر" میں بکھرے ہوئے دنیا کے راز
تیری نظروں میں "بشر" کی انقلابی شان بھی
تو بہر لمحہ، کیا کرتا ہے "تنقیدِ حیات"
نقش جو تو نے بنایا ہے مٹا سکتی نہیں

سبز ہے تیری عرق ریزی سے اردو کا چمن
گل بداماں تھا ترے دم سے "ریاضِ علم و فن"

مولانا دریابادی کی زندگی ایک جویائے حق کی زندگی تھی وہ تدریج دین کی طرف آئے لیکن اس کوچہ میں قدم رکھتے ہی ان کا شمار مذہب کے عاشقوں میں ہونے لگا انہوں نے اپنی دینی حمیت، جاندار اور تیکھے اسلوب، طنز ونشتر اور مخالف دین نظریات پر دقیق گرفت کے ذریعہ نہ جانے کتنے دلوں میں ایمان کی چنگاری کو شعلہ سے بدل دیا ہوگا۔ اور نہ جانے کتنے شک وتشکیک کے شکار ذہنوں میں اسلام پر ازسرنو اعتماد پیدا کیا ہوگا۔

مولانا دریابادی جس نشیب وفراز سے گذر کر اسلام کی منزل تک آئے ان کی وہ آپ بیتی بجائے خود اپنے اندر علم ومطالعہ اور پند وموعظت کا بڑا سامان رکھتی ہے۔ انہوں نے زندگی کے اک اک لمحہ کو امانت الٰہی سمجھا اور وقت کی قدر وقیمت کا ہمیشہ لحاظ رکھا انہوں نے اپنے پیچھے جو گرانقدر علمی وادبی ورثہ چھوڑا اور ہمارے کتب خانوں میں قیمتی اضافہ کیا، اس میں ان کی منظم اور منضبط زندگی اور لکھنؤ جیسے مرکزی شہر کو چھوڑ کر دریاباد جیسے گمنام مقام پر علمی اعتکاف کو بڑا دخل ہے۔

علامہ شبلی نعمانی نے علم وادب، تاریخ وتحقیق اور درس وتدریس کی مختلف وادیوں سے گذر کر سیرت جیسے عظیم موضوع پر لکھنے کا ارادہ کیا و اپنے جذبات کو ان اشعار میں ڈھال دیا ؎

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب میں لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

علامہ شبلی کے ایک طرح سے معنوی شاگرد مولانا دریابادی بھی علم وادب کی مختلف بارگاہوں سے گذر کر کلام الٰہی کے آستانے تک پہونچے اور کامل ۴۰ برس تک بلکہ زندگی کے آخری لمحہ تک اسی کے ہو رہے۔ مولانا دریابادی کی تفسیر اپنی جدت، ندرت، مطالعہ وتحقیق اور مذاہب عالم پر ناقدانہ نظر کے اعتبار سے عالم اسلام میں اپنی نظیر آپ ہے۔

تحریک ندوۃ العلماء اور اس کے مقاصد وتخیل کے وہ بڑے قائل اور داعی تھے، ۱۹۵۵ء میں انہوں نے پاکستان کا سفر کیا۔ ڈھائی ہفتہ سلطنت خداداد اور جمہوریۂ اسلامیہ پاکستان میں قیام کے دوران ندوۃ العلماء کے فکر وتخیل کی اصابت اور ضرورت کا انہوں نے اپنے سفر نامہ میں اس اعتماد کے ساتھ ذکر کیا!

"بڑا دکھ یہ دیکھ کر ہوا کہ قدیم وجدید گروہوں میں بیگانگی اچھی خاصی پیدا ہو گئی ہے، گویا دینداروں اور روشن خیالوں کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے اور جب باہمی بدگمانیاں جڑ پکڑ چکی ہیں تو یہ نتیجہ بھی بالکل قدرتی ہے کہ ایک فریق کی سیدھی سی سیدھی بات بھی دوسرے کو تیر ونشتر ہو کر لگتی ہے اور علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کے درمیان بے اعتباری کا یہ زور ہے کہ یہ اگر دو اور دو کو چار کہیں تو وہ ان کی ضد میں آکر اس بدیہی حقیقت کو بھی جھٹلا دیں۔ اور اقبالؒ کی یہ شاعری کچھ حقیقت سی بن گئی ہے ؎

واعظ دلیل لائے جو مے کے جواز میں
اقبالؔ کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

زخم کے اندمال اور چوٹ کے التیام کا کام ندوہ ہی کی قسم کی کوئی جماعت انجام دے سکتی ہے جو روح اور مغز کے لحاظ سے قدیم اور شکل وقالب کے لحاظ سے جدید۔ صراحی اور گلاس نئے ہوں اور ان کا مشروب وہی جانا پہچانا ہوا پرانا ــــ جب تک کوئی ندوہ جدید میدان عمل میں آئے۔ اس قسم کے ادارے اس کی جانشینی خاص حد تک کر سکتے ہیں۔"

تفسیر ماجدی، حکیم الامت نقوش وتاثرات، محمد علی ذاتی ڈائری، اعلام القرآن، بشریت انبیاء، خطبات ماجدی، تمدن اسلام، فلسفہ جذبات، اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں جیسے علمی ذخیرہ اور سچ اور صدق کے کالموں سے ان کے دلوں کی تپش اور ان کے شبوں کے گداز کا اندازہ آنے والی نسلوں کو ہوتا رہیگا۔ ندوۃ العلماء سے ان کے دیرینہ روابط، فضلائے ندوہ سے ان کے برادرانہ اور عزیزانہ مراسم، طلبائے ندوہ سے اُن کا ایک شفیق سرپرست کا سا سلوک ان سب کا تقاضا تھا کہ ان کی یاد، ان کی خدمات اور ان کی پہلودار شخصیت وسیرت کو ندوہ کے ترجمان تعمیر حیات میں بھی محفوظ کیا جائے۔ عجلت میں یہ اشاعت خاص، اس شخصیت کی نذر ہے جو مدح وذم سے بے نیاز اپنے رب کی بارگاہ میں پہونچ چکی ہے۔

اب تو احسان شناسی کا تقاضہ ہے کہ ہم جانے والے کی اس وصیت کو اپنی زندگی کا معمول بنائیں:۔

"اپنے مخلصین سے طمع رکھتا ہوں کہ دعائے مغفرت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے اگر ہر روز تین بار سورۂ اخلاص کا معمول بنایا جا سکے تو سبحان اللہ"۔

{وصیت نامہ ماجدی شائع شدہ صدق جدید مورخہ ۴ جنوری ۷۷ء}

علی گڑھ کے "رجل رشید"

"تعمیر حیات" کے اس خصوصی شمارہ کے لئے مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی پر رشید صاحب کے مضمون کا انتظار تھا، امید تھی کہ مختصر ہی سہی وہ لکھیں گے ضرور۔ لیکن یہ خط علی گڑھ اس وقت پہونچا جب رشید صاحب پر غفلت طاری ہو چکی تھی، اسی حالت میں ۱۵ جنوری ۷۷ء کو اردو ادب اور سرسید کے علی گڑھ کو سوگوار چھوڑ کر رشید صاحب اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کی وفات ہم سب کے لئے ایک سانحہ اور ناقابل تلافی نقصان ہے تاہم اردو ادب اور علی گڑھ کے تعلیمی مرکز کو انہوں نے اپنی تحریروں سے جس طرح جاودانی بخشی، جیسا کچھ سجایا سنوارا اور اس کا اعتبار اور وقار بڑھایا وہ انہی کا حصہ تھا۔ طنز وظرافت اصناف ادب کی ایک نازک شاخ ہے لیکن رشید صاحب اس نازک مرحلہ سے جس خوبی سے گذرے اس کی نظیر اردو ادب میں نہیں ملتی، رشید صاحب منفرد اسلوب کے مالک تھے، ان کی تحریروں میں مطالعہ کی گہرائی، ایک فنکار کا عمل اور ایک مصور کی عکاسی جھلکتی ہے، ان کی عمیق نظر سے سماج وسیاست، جماعت وشخصیت اور تحریک وانجمن کا کوئی پہلو اوجھل نہیں رہتا۔ سرسید کی ملی خدمات، ایم۔اے۔او کالج کے لیل ونہار اور مسلم یونیورسٹی کے شب وروز کے اس قصیدہ خواں نے مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی صدارت سے ریٹائرڈ ہو کر یہیں اپنا نشیمن بنا لیا بقیہ زندگی یہیں گذاردی اور اسی محبوب زمین کے گوشہ میں آسودہ خاک ہو گئے۔

۲۲ جنوری کو مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے زیر اہتمام منعقدہ سیمینار میں علی گڑھ حاضری ہوئی۔ ڈاکٹر فصیح صدیقی نے بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ وقت موعود کی تفصیل سنائی، تعزیت کے لئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی معیت میں ہم رشید صاحب کے گھر پہونچے، لان میں خوبصورت گلاب کے پھول کھلے ہوئے تھے لیکن وہ "بوڑھا مغنی" نہیں تھا جس کی باغ وبہار شخصیت اور پُرلطف وشگفتہ گفتگو کانوں میں رس گھولتی تھی۔ رشید صاحب کو ندوہ سے بڑا تعلق تھا، ۱۹۶۷ء میں انہوں نے طلبائے ندوہ کی یونین "الاصلاح" کی دعوت پر اپنا مقالہ "عزیزان ندوہ کے نام" پڑھا۔ اس جلسے کی صدارت کرتے ہوئے مولانا دریابادی نے یہ فرمایا تھا:۔

"رشید صاحب نمائندہ علی گڑھ کے، آپ کی مجلس نائب و نمائندہ ندوہ کی علی گڑھ اور ندوہ کے درمیان نہ وہ بیگانگی ہے نہ وہ دوری جو فرض کرلی گئی ہے . . . . مقالہ کو شروع سے آخر تک سُن لینے کے بعد کس میں ہمت رہ جائے گی جو علی گڑھ کو مخاطب کرکے کہہ سکے: "الیس منکم رجل الرشید"

مولانا سید سلیمان ندوی کے عقیدتمند، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قدرداں، اردو ادب کو تب وتاب بخشنے والے رشید صاحب بحیثیت ایک شریف انسان بھی ناقابل فراموش ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس "رجل رشید" کے درجات بلند فرمائے۔ اور ادب وانسانیت کو اس کا بدل نصیب فرمائے۔

زیر نظر شمارہ تین شماروں پر مشتمل ہے۔ ۱۰، ۲۵ جنوری اور ۱۰ فروری ۷۷ء ــ ۳۶ صفحات ــ قیمت ۱/۵۰

مولانا عبدالماجد دریابادی پر اس دور کا خاتمہ ہوتا ہے جس دور میں علم وادب

چشمے باہم مل کر چلتے تھے

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں منعقدہ جلسہ تعزیت میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا خطاب

✳

تعزیتی جلسے دینی حیثیت سے کوئی اہمیت یا تقدس نہیں رکھتے، یہ جلسے اس دنیا سے سفر کرنے والے عزیز یا بزرگ کے تعلق وارتباط کا اظہار کرنے کے لئے منعقد کئے جاتے ہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء جو دینی تعلیم کا مرکز ہے اور اس کا ہر عمل سند کا درجہ رکھ سکتا ہے اس کے لئے ان جلسوں کی اہمیت وضرورت اس لئے نہیں کہ اس سے محض جذبات وتعلق کا اظہار ہو بلکہ اس لئے ہے کہ ان تعزیتی جلسوں سے جانے والے کی سیرت وکمالات سے واقفیت کا ایک موقع مل جاتا ہے اور عزیز طلبہ اور نوجوانوں کے سامنے جانے والوں کی سیرت کے ایسے پہلو سامنے رکھنے کی ایک اچھی تقریب اور تحریک پیدا ہو جاتی ہے جو ان کے لئے بہت مفید سبق آموز اور بعض اوقات انقلاب آفریں ہوتی ہے۔ ہمارے لئے یہ دونوں باتیں کشش رکھتی ہیں۔

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ کا اس درسگاہ سے بلکہ اس انجمن سے جس نے اس درسگاہ کو پیدا کیا اور اس کے بانیوں اور فرزندوں سے جنہوں نے اپنے خون اور پسینے سے سینچ کر تناور درخت بنایا اور ہم آپ سب اس کے سائے میں پھل پھول رہے ہیں ان کے ساتھ عزیزانہ، برادرانہ، رفیقانہ اور فرد خاندان کا تعلق تھا ــ انسانیت، شرافت اور مکارم اخلاق کا تقاضا ہے کہ ہم اس موقع پر ان کی یاد کریں اور اپنے عزیزوں کو ان کے لئے ایصال ثواب اور دعائے مغفرت کے لئے آمادہ کریں۔

دوسری وجہ جو ہمارے لئے زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور یہی اس جلسے کی باعث بنی ہے کہ ان عزیزوں کے سامنے جنہوں نے صرف ان کی ایک جھلک ہی دیکھی یا اخبار ورسائل اور کتابوں میں ان کا نام پڑھا یا کبھی ان کی زیارت یہاں مجلس انتظامی کے جلسے میں تشریف آوری کے موقع پر کی اور ایسے بھی ہوں گے جنہوں نے شاید انہیں دیکھا بھی نہ ہو خاص طور پر اس سال آنے والے طلبہ کی کثیر تعداد ایسی بھی ہوگی کہ ان کے سامنے ہم ان کی زندگی کے ایسے پہلو رکھیں جو ان کے لئے سبق آموز ہیں اور ہم ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

مختلف وجوہ سے میرے لئے یہ فریضہ ناخوشگوار بھی ہے اور دشوار بھی۔ فریضہ بہرحال فریضہ ہے، بعض فریضے خوشگوار ہوتے ہیں بعض ناخوشگوار ہوتے ہیں، میرے لئے یہ فریضہ ادا کرنا سعادت کی بات ضرور ہے مگر ناخوشگوار بھی ہے اور دشوار بھی ــ ناخوشگوار اس لئے کہ میرا تعلق ان سے خورد و بزرگ کا تعلق رہا۔ میں ان کے لئے ہمیشہ خورد رہا اور اس پر مطمئن اور نازاں ہوں۔ کچھ ایسے حالات اور خاندانی روابط رہے کہ میں ہمیشہ اپنے کو ان کے خاندان کا ایک فرد سمجھتا رہا۔ اور میرے معاصرانہ تعلقات ان کے عزیزوں خاص طور پر ان کے بڑے بھتیجے حکیم عبدالقوی صاحب سے رہے ہیں۔

مولانا دریابادیؒ کو میں ہمیشہ ایک استاد اور بزرگ کی حیثیت سے دیکھتا رہا اور سمجھتا رہا۔ میں نے ان سے بہت کچھ فائدہ حاصل کیا جیسا کہ میں نے مدراس میں ان کی سیرت کی تقریروں میں کہا تھا کہ میں ان کا معنوی شاگرد ہوں۔ جو شاگردوں سے کسی طرح کم نہیں جوہر اور مقدار کے اعتبار سے کسی طرح حقیقی شاگرد سے کم نہیں جو میں نے ان سے استفادہ کیا۔ مجھ جیسے خورد کے لئے ان جیسے بزرگ کے لئے کچھ کہنا جہاں ایک دشوار فریضہ ہے وہاں ایک کسی حد تک خوشگوار فریضہ بھی۔ اگر اس کو کوئی چیز خوشگوار بنا سکتی ہے یا گوارہ بنا سکتی ہے تو وہ اظہار تعلق ہے جو میرے ان کے درمیان تھا نیازمندی کا تعلق، خوردی اور بزرگی کا تعلق قدردانی اور ان کے کمالات کے معترف کے اعتبار سے جو میرا تعلق تھا اور دوسرے یہ کہ میں سمجھتا ہوں کہ میں ان کی زندگی کے بعض پہلوؤں سے واقف ہوں اور ان کو آپ کے سامنے بیان کر سکتا ہوں اور آپ اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

انگریزی دور اقتدار نے دور اقبال میں جو چند بہترین مسلمان پیدا کئے، زیادہ صحیح الفاظ میں انگریزی نظام تعلیم اور اس کے مقاصد اور اس کے بانی اور اساتذہ کے علی الرغم انگریزی نظام تعلیم کے سائے میں اور انگریزی نظام تعلیم کے مرکزوں میں جو چند بہترین مسلمان ملت اسلامیہ میں پیدا ہوئے، ان کے سرخیل علامہ اقبالؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا ظفر علی خان اور ان ممتاز ترین افراد میں بہترین فرد مولانا عبدالماجد دریابادی تھے۔

میں اس موقع پر ان برگزیدہ حضرات کا نام نہیں لوں گا جو ہماری دینی تعلیمی مرکزوں میں پیدا ہوئے میری مراد مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ ہیں۔ یہ حضرات ان چار پانچ شخصیتوں کے ساتھ بہت سے کاموں میں شریک، رفیق، ہم مذاق اور ہمنوا رہے ہیں، لیکن جدید نظام تعلیم کے پروردہ اور فیض یافتہ نہیں تھے بلکہ ہماری قدیم درسگاہوں کے بہترین ثمرات اور بہترین نتائج تھے لیکن علامہ اقبالؒ، مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا عبدالماجد دریابادی اور اس فہرست میں کئی نام لئے جا سکتے ہیں لیکن وہ آپ کے لئے اتنے معروف نہیں ہونگے اور ان کے کارنامے اتنے روشن نہیں ہوں گے۔

ان بزرگوں کے درمیان جہاں مابہ الامتیاز چند چیزیں ہیں تو وہیں ان کے درمیان بعض باتیں مشترک ہیں۔

ان چار پانچ بزرگوں میں دو چیزیں قدرے مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں ایک تو اسلام سے گہرا لگاؤ، علمی، ذہنی، فکری، جذباتی اور اس کی قیادت کی صلاحیت اور اس کے آخری دین ہونے پر اور انسانیت کے لئے باعث ہدایت ہی نہیں بلکہ باعث نجات ہونے پر ان کا مستحکم یقین۔ اقبال ہوں یا مولانا ظفر علی، مولانا محمد علی ہوں یا مولانا عبدالماجد دریابادی یہ سب اس میں برابر کے شریک ہیں۔

ان کا دوسرا جوہر جو ان کے درمیان قدرے مشترک ہے مغربی تہذیب اور مغربی اقتدار سے بغاوت اور سرکشی اس سے آنکھیں ملانا اس کے چیلنج کو قبول کرنا اس کو رد کرنا اس کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا یہ چیز بھی ان چار پانچوں میں مشترک ہے اس کے مظاہر بے شک مختلف ہیں کسی نے تحریک خلافت کی قیادت کی جیسے مولانا محمد علی کسی نے اپنے شعر وادب کے ذریعہ مغربی استعمار کے خرمن کو آگ لگا دی جیسے اقبالؒ ہیں یا مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی جنہوں نے "صدق" کے ذریعے "سچ" کے ذریعہ اپنے تبصروں اپنے نوٹس اپنے ادبی طنز نگاری کے ذریعہ مغربی تہذیب کی دھجیاں اڑا کے رکھ دیں اور اسے بے وقعت بنا دیا اور سیکڑوں اور ہزاروں دلوں میں (جن میں میری حقیر ذات بھی ہے) مغربی تہذیب کے خلاف ایک جذبہ پیدا کر دیا یہ دوسرا جوہر ہے جو ان سب کے درمیان قدرے مشترک ہے۔

تیسری چیز علم وادب دونوں سے تعلق یعنی مولانا عبدالماجد دریابادی ادیب و نقاد تھے۔ زبان کے ادا شناس اور مزاج اسی کی نوک پلک اور طریقۂ استعمال کے لحاظ سے ان کا پایہ بہت بلند ہے۔ یہ کام اردو نقادوں اور اردو ادب کی تاریخ لکھنے والوں کا

←

ہے کہ اس پہلو پر روشنی ڈالیں۔ میں نے بھی اپنے بعض مضامین میں جو بعض رسالوں میں شائع بھی ہوئے ہیں اس کا ذکر کیا ہے۔

جو تھی بات جو ان سب کے درمیان مشترک تھی وہ تھی دینی غیرت۔ یعنی ان سب میں دینی حمیت کا ایک جوہر پایا جاتا تھا، جب کوئی فتنہ کھڑا ہوا جب کوئی نیا چیلنج آیا یا کسی نے اسلامی شریعت اور اسلامی تہذیب کے ساتھ شوخی کی تو مولانا عبدالماجد صاحب علم جہاد لے کر کھڑے ہو گئے۔

یہیں لکھنؤ میں "نگار" نے مسلسل انکار حدیث پر مضامین لکھنے شروع کئے تو اس کا نوٹس سب سے پہلے مولانا عبدالماجد صاحب نے لیا اور نگار اور نیاز فتحپوری کی زبان بند ہو گئی۔ انہوں نے دین کی کسی توہین کو یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر کسی حملہ کو برداشت نہیں کیا۔ اس سلسلے میں مولانا عبدالماجد صاحب کی حمیت اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ یورپ میں کوئی تصویر شائع ہو جاتی یا کوئی غلط بیانی یا دین کا استخفاف ہوتا تو عالم اسلام میں سب سے پہلے اس کا نوٹس وہی لیتے، اور عالمی محبت کا فرض انجام دیتے تھے اور یہی آخری چیز ان کی مغفرت کا بہت بڑا پروانہ ہے۔ انکے حسنات بہت ہیں۔

لیکن میرے نزدیک انکا بہت جوہر ہے کہ وہ دین کی توہین کی تاب نہیں لا سکتے تھے۔ خود بے چین ہوتے اور دوسروں کو بے چین کرتے تھے۔ ان کا قلم خامۂ نر نگار کی طرح نہیں بلکہ تیغ آبدار کی طرح اپنے جوہر دکھاتا تھا۔

میں اس حال میں نہیں کہ مفصل تقریر کر سکوں، میں نے اختصار سے کام لیتے ہوئے ان چار صفات پر روشنی ڈالی ہے جو ان برگزیدہ ہستیوں میں قدر مشترک تھیں۔

میں اپنے محدود علم و مطالعہ کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ مراکش سے انڈونیشیا تک ان شخصیتوں کی نظیر نہیں ملتی۔

یہ چند نمونے جو میں نے آپ کے سامنے بیان کئے حقیقت میں اس دور کی یادگار اور پیداوار تھے جب علم و ادب کا رشتہ ملا ہوا تھا، علم اور ادب میں کوئی مغائرت اور رقابت نہیں تھی جیسا بعد میں پیدا ہو گئی۔ اس زمانہ کا ادیب عالم ہوتا تھا اور عالم ادیب۔ ہندوستان کے ایوان ادب کے چاروں ستون عالم ہیں، مولانا شبلیؒ، مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزاد یہ سب اسی قدیم نصاب تعلیم کی پیداوار ہیں مولانا عبدالماجد صاحب پر اس دور کا خاتمہ ہوتا ہے جس دور میں علم و ادب کے چشمے باہم مل کر چلتے تھے اور انکے درمیان کوئی برزخ نہیں تھا۔ ان میں تمیز کرنا مشکل تھا کہ کونسا دھارا علمی اور کونسا دھارا ادبی ہے۔ علم ادب کے ساتھ اور ادب علم کے ساتھ اور اس کی نگرانی میں تھا۔ یہ اس دور کی بڑی خصوصیت تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ مولانا عبدالماجد صاحب پر یہ دور ختم ہو رہا ہے، ان ہی کے شاگردوں اور فیض یافتہ لوگوں میں کچھ نمونے شاید موجود ہوں۔

مولانا دریابادی کے مقام کو متعین کرنے کے لئے مختصر طور پر ان کی پہلو دار شخصیت اور جامع کمالات بلکہ جامع اضداد زندگی کے چند پہلو پیش کئے۔ حقیقتاً یہ چیزیں اضداد نہیں لیکن علمی انحطاط اور اخلاقی زوال کی وجہ سے یا نظام تعلیم کا اعلیٰ معیار نہ ہونے کی وجہ سے علم و ادب میں رقابت سمجھ لی گئی ہے۔ علم کے ساتھ یہ ضروری نہیں سمجھا جاتا کہ اس کے ساتھ کوئی سرگرمی، کوئی نشاط یا تحریکی صلاحیت ہو۔ مولانا کا اس دور پر تقریباً خاتمہ ہوتا ہے۔ خدا کرے نہ ہو کوئی اچھی بات نہیں ہے لیکن اندیشہ ہے کہ ان پر اس دور کا خاتمہ ہو جائے۔

جس دور کی یہ خصوصیات تھیں کہ ادیب عالم بھی ہوتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب اقدار کا منکر اور باغی ہوتا۔ اس کے اندر دینی حمیت اسلام اور اسلامی تہذیب کے ساتھ ذہنی، علمی، جذباتی لگاؤ بھی رکھتا تھا۔

مولانا کی زندگی میں چند سبق آموز باتیں تھیں جن کا مجھے ذاتی طور پر علم بھی ہے اور تجربہ بھی ہوا

اور اس سے میں نے فائدہ اٹھایا۔

پہلی چیز تو یہ ہے کہ اللہ نے انھیں توفیق دی کہ انہوں نے ایک جلیل القدر عظیم المرتبت موضوع یعنی تفسیر قرآن کا انتخاب کیا اور پھر اپنی صلاحیتیں و توانیاں اس کے لئے وقف کر دیں۔ ان کی تفسیر قرآن سے جو واقف نہیں ہیں وہ یہ سمجھیں گے کہ انہوں نے ایک تفسیر لکھی ہے جیسے اور بہت سے لوگوں نے تفسیریں لکھی ہیں۔ لیکن مولانا نے اپنے مطالعہ کے دوران اور صدق کی ادارت کے زمانہ میں اسکی ضرورت محسوس کی کیونکہ وہ اسی مرکز سے آئے تھے جن مراکز میں شکوک و شبہات کے فتنے، تشکیکی خیالات اور قرآن مجید کے اعجاز و صداقت پر اعتراضات ہوتے ہیں۔ مستشرقین کے خیالات سے انہیں براہ راست واقفیت تھی۔

انہوں نے محسوس کیا کہ اسے ایسی تفسیر، ترجمہ و حواشی کی ضرورت ہے جن میں قرآن مجید کا اعجاز ثابت کیا جائے اور یہ دکھایا جائے کہ جو مضامین و علوم قرآن میں ہیں وہ صداقت پر مبنی ہیں اور جدید علم و جدید تہذیب نہ صرف یہ کہ ان کی تردید نہیں کرتے بلکہ ان کے لئے شہادت فراہم کرتے ہیں اور یہ ثابت ہو کہ ایک امی پیغمبر پر جو صحرائے عرب میں پیدا ہوا اور وہیں زندگی گذاری اس کی زبان سے اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کے ذریعہ وہ حقیقتیں ظاہر کی ہیں کہ آج تیرہ سو برس اور ہزار برس کے بعد جب سے یورپ میں تہذیبی ترقی کا دور شروع ہوا ہے، حجاب اٹھتے جا رہے ہیں اور نئی نئی چیزیں سامنے آ رہی ہیں کھدائیاں ہو رہی ہیں انکشافات ہو رہے ہیں۔ نئی نئی تحقیقات ہو رہی ہیں اسکے باوجود قرآنی صداقتیں اور مستحکم ہوتی جاتی ہیں یہ کام حقیقت میں جو امت کے ذمہ قرض تھا اور اسلاف نے اپنے دور میں بڑی حد تک یہ خدمت انجام دی۔ امام رازی نے تفسیر کبیر کے ذریعہ بڑا کام کیا اور اس دور کے لحاظ سے انہوں نے یہ قرض ادا کر دیا تھا کہ یونانی فلسفے اور اس کے اعتراضات کو سامنے رکھ کر قرآن مجید کے اعجاز و صداقت کو ظاہر کیا۔

علم کلام اور قرآن مجید کا موضوع ایسا کہ اس کو کسی وقت مکمل نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ علم برابر ترقی کرتا رہتا ہے اس میں برابر نئے تجربوں،

دانشوں اور دریافتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ حقیقت میں یہ کام امت کے ذمہ قرض تھا اور یہ کام تین ملکوں سے ہو سکتا تھا۔ ترکی، مصر یا پھر ہندوستان لیکن میں اپنی معلومات کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان جتنی خوبی سے یہ کام انجام دے سکتا تھا کسی دوسرے ملک کے لئے ممکن نہ تھا۔

اس میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا بہت بڑا حصہ ہے اور عرصہ تک رہیگا انہوں نے اپنے تمام مشاغل کو برطرف کر کے قرآن مجید کے سلسلے میں تقابلی مطالعہ شروع کیا اور انگریزی زبان میں جتنے بھی ماخذ ہو سکتے تھے انہوں نے جمع کئے۔ مختلف انسائیکلوپیڈیا جن کی قیمت سیکڑوں روپے سے کم نہیں انہوں نے خریدے، بائبل کا گہرا مطالعہ کیا اور اس کے الفاظ کی تشریح و توضیح کے لئے تمام مسیحی لٹریچر کا جائزہ لیا۔ جغرافیہ کی وہ کتابیں جن سے قرآن مجید کے سلسلے میں وہ مدد لے سکتے تھے ہزاروں روپیہ صرف کر کے جمع کیں اور انگریزی میں قرآن مجید کی وہ تفسیر لکھی جو اپنی بعض خصوصیات میں منفرد ہے۔ انہوں نے وہ کام کیا جو بہت محنت طلب تھا بہت دیدہ ریزی کا تھا اس کام کو وہی انجام دے سکتا تھا جس نے قرآن مجید کے عشق کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہو۔

برصغیر ہند و پاک میں بہت کم لوگ ہوں گے جو مولانا عبدالماجد کی طرح ہوں وہ فلسفہ کے سب سے ذہین طالب بلکہ مجتہد تھے ان کی کتاب جو انگریزی میں لندن میں چھپی تھی۔ یونیورسٹی کے کورس میں داخل کی گئی، پڑھنے کو انھیں شوق نہیں بلکہ عشق تھا وہ وقت کی قدر و قیمت جانتے تھے اور بے حد محنت کے عادی تھے وہ کام جو درحقیقت یورپ میں پوری اکیڈمی کرتی ہے، انہوں نے تنہا انجام دیا مولانا عبدالماجد صاحب کے لئے تفسیر کا موضوع بالکل نیا تھا لیکن انہوں نے اس سلسلے میں جو مواد جمع کیا ہے اور قرآن مجید کے اعجاز کو عصر جدید اور جدید تحقیقات کی روشنی میں ثابت کیا ہے اسکی تفصیل کا یہاں موقع نہیں اہل علم ان کی اس علمی خدمت سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

وقت کی پابندی بلکہ زندگی کی قیمت وصول کرنے میں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا عمل ہم سب میں

بقیہ صفحہ ۵ پر

الحاد و تشکیک سے ——— ایمان و اسلام تک

از مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی رح

آنکھ کھلی ایک خاصے مذہبی گھرانے میں۔ باپ (اللہ ان کی تربت ٹھنڈی رکھے) ایک اچھے سرکاری عہدہ دار ہونے کے باوجود عملاً مولوی اور عملاً دیندار، ماں (اللہ) شب بیدار، تہجد گذار ـــ زمانہ انیسویں صدی عیسوی کے اخیر کا۔ گھر پر مشرقی تعلیم کا چلن ایک حد تک باقی تھا۔ مولوی صاحب کے پاس پڑھنے بٹھائے گئے۔ قرآن (ناظرہ) کیساتھ اردو بھی شروع ہو گئی، مولوی محمد اسمٰعیل صاحب میرٹھی مرحوم کی ریڈریں کچھ اس طرح مزہ لیکر پڑھیں کہ ان کی شیرینی اب تک یاد ہے اور اردو ٹوٹی پھوٹی جو کچھ بھی لکھنی آگئی، اس کی بنیاد اسی وقت سے پڑ گئی۔ فارسی میں گلستاں، بوستان، رقعات قتیل، یوسف زلیخا کے علاوہ کیمیائے سعادت بھی کچھ سمجھے۔ اور زیادہ تر بے سمجھے جوں توں ختم کر ڈالی۔ داخلہ اسکول میں ہوا، زبان عربی لی۔ استاد ملے شفیق۔ عربی سے جو الجھن اور وحشت نہ ہونے پائی۔ تصرف ہے انھیں بزرگوں کا۔

ابھی بچپن ہی تھا کہ ایک انگریزی تعلیم یافتہ "چچازاد" بھائی نے شوق اخبارات کا پیدا کیا۔ دل خارجی مطالعہ میں لگنے لگا۔ اخبار، رسالہ، اشتہار، کتاب جو چھپی سامنے آجاتی مجال نہ تھی کہ بچ کر نکل جائے۔ اردو کے علاوہ انگریزی، فارسی، عربی میں کچھ نہ کچھ شُدبُد تو ہو ہی گئی تھی۔ فقہ، تفسیر، تاریخ، تصوف، منطق، مناظرہ، ادب، فسانہ، ناول، ناٹک، کلب، شاعری سب ہی کچھ تو اس میں آ گیا۔ جوش خاصہ مذہبی موجود تھا۔ آریوں اور عیسائیوں کی مناظرانہ کتابوں پر نظر پڑی۔ اک آگ سی لگ گئی، تلاش جوابات کی ہوئی۔ دھن ہی سوار ہو گئی۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری کی ترک اسلام وغیرہ، مرزا غلام احمد قادیانی کی سرمہ چشم آریہ وغیرہ، حکیم نورالدین کی "نورالدین"، مولانا محمد علی مونگیری ناظم ندوۃ العلماء کا ماہنامہ "تحفۂ محمدیہ" اسی دور کی یادگار رہیں ـــ اور ہاں ایک نام تو ذہن سے نکلا ہی جاتا تھا اب وہ بیچارے یوں ہی گمنام ہو گئے ہیں۔ مولوی احسان اللہ عباسی وکیل گورکھپور، مصنف "الاسلام، تاریخ الاسلام" وغیرہ۔ ذوق و شوق سے ساری کتابیں پڑھیں۔ اور اپنی بساط کے لائق کچھ لکھا لکھایا بھی، ادبی میدان میں شرر مرحوم اور انکے معاصرین منشی سجاد حسین اودھ پنچ وغیرہ کا دور دورہ رہا۔

یہ دور کہنا چاہیے کہ ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۷ء تک رہا۔ ۱۹۰۸ء میں نیاز "مقالات شبلی" اور "الکلام" سے حاصل ہوا۔ اور اسی دم سے جادو مولانا شبلیؒ کا چل گیا۔ تلاش ان کی اور تحریروں کی شروع ہوئی انھیں پڑھتا نہ تھا تلاوت کرتا تھا۔ "الندوہ" والد مرحوم کے نام جاری کرایا۔ پرانا پرچہ سناتا۔ تازہ پرچہ کے لئے دن گنا کرتا۔ مولانا کے ہر مضمون کی ایک ایک سطر بار بار پڑھتا، فقرے کے فقرے حفظ ہو گئے۔ کتنیں زبان پر چڑھ گئیں بھنوں سے کہتا پھرتا بلکہ لڑتا پھرتا کہ علامہ شبلی اس دور کے مجدد ہیں۔ نذیر، حالی، سرسید، آزاد کے ساتھ بھی حسن اعتقاد قائم رہا۔

۱۹۰۸ء میں عمر کا سولہواں سال تھا کہ میٹرک پاس کر، لکھنؤ میں کالج میں داخل ہوا۔ اور اب انگریزی کتابوں پر ٹوٹ پڑا۔ اتفاق سے شروع ہی میں ایک بڑے انگریز ڈاکٹر کی کتاب سامنے آگئی۔ ظالم نے کھل کر اور بڑے زوردار الفاظ میں مادیت کی حمایت اور مذہب و اخلاق دونوں سے بغاوت کی تھی۔ موضوع یہ تھا کہ عصمت اور نیک چلنی کے کوئی معنی نہیں محض پرانے لوگوں کا گڑھا ہوا ڈھکوسلہ ہے۔ اصل شے صحت اور مادی راحت ہے۔ صحت کا خیال رکھ کر جو کچھ جی میں آئے کرو نکاح وغیرہ کی قیدیں سب لایعنی ہیں۔ مصنف کے پیش نظر اسلام یقیناً نہ تھا لیکن زد تو بہرحال اسلام پر پڑتی ہی تھی۔ خیالات ڈانوا ڈول ہونے لگے۔ اسی زمانہ میں اتفاق سے ایک اور کتاب بھی نظر سے گذری ـــ یہ ادبی تھی۔ مشاہیر عالم کے اقوال و خیالات پر، اس میں ایک جگہ پورے قد کی تصویر صفحہ بھر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی درج تھی۔ اور نیچے سند بھی تھی، کہ فلاں (غالباً روما) کے میوزیم میں قلمی تصویر موجود ہے۔ یہ اس کا فوٹو ہے۔ حلیہ یہ تھا کہ سر پر عمامہ، جسم پر عبا، تلوار کمر سے بندھی ہوئی، شانہ پر ترکش، ہاتھ میں کمان، تیور وں پر بل پڑے ہوئے۔ آنکھوں سے غصہ، بشرہ سے تندخوئی عیاں۔ شان رحمۃ للعالمین الگ رہی بھول نرم دلی اور نیک مزاجی کے آثار بھی یکسر مفقود نیچے سند درج، مغربیت سے مرعوب۔ دماغ کے لئے اب شک و شبہ کی گنجائش ہی کہاں رہ گئی تھی؟

دماغ پہلے ہی مفلوج ہو چکا تھا اب دل بھی مجروح ہو گیا۔ ارتداد دبے پاؤں آیا، اسلامیت کو ہٹا، ایمان کو ہٹا، خود مسلط ہو گیا آریت، مسیحیت دوسرے مذاہب سے دل پہلے ہی سے ہٹا ہوا تھا۔ اب کھلم کھلا آزادی اور آزاد خیالی کی حکومت قائم ہو گئی۔ الحاد کا نشہ بے دینی کی ترنگ، ریشنلزم (عقلیت) سے جنگ بڑھے، ایگناسٹیسزم (لاادریت) میں بانہ گنتھا۔ لندن کی ریشنلسٹ ایسوسی ایشن (انجمن عقلیین) کی ممبری قبول کر، سارا وقت ہیوم مل، اسپنسر، ربی، ہکسلے، ہیگل، زنگ تول، بریڈلے، یونسز، ڈاروِن اور یونانی حکماء، مادیین متشککین وغیرہ کی نذر ہونے لگا۔ مل کو اتنا پڑھا، اتنا پڑھا کہ لڑکوں میں مل کا حافظ مشہور ہو گیا۔ اور ایک اور کتاب طب سے متعلق عضویات دماغی (Mental Physiology) پر ایک مشہور انگریز ڈاکٹر کی اسی زمانہ میں نظر سے گزری۔ ذکر امراض عصبی و دماغی کا تھا۔ بدبخت نے مرض صرع کے ضمن میں لکھا تھا کہ اس کی علامات کو پرانے زمانہ میں لوگ "وحی الٰہی" سمجھنے لگتے تھے، اور مصروع کے عام قوائے دماغی تو بہت اچھے ہوتے ہیں۔ وہ دنیا میں انقلاب برپا کر سکتا ہے۔ مذہب اور سلطنت دونوں قائم کر سکتا ہے۔ وقس علیٰ ہذا ـــ ارتداد الحاد اور اسلام بیزاری میں اگر کچھ کسر باقی تھی، تو اب پوری ہو گئی۔ ایف۔ اے کے امتحان کی فیس جانے لگی تو فارم میں جہاں مذہب کا خانہ ہوتا ہے وہاں بجائے مسلمانوں کے ریشنلسٹ لکھ دیا!

الحاد بے دینی یا عقلیت کا یہ دور کوئی ۸ ـــ ۱۰ سال تک قائم رہا۔ ایف۔ اے بی۔ اے کی تکمیل ہوئی۔ ایم۔ اے کی تکمیل نہ ہوئی لیکن تعلیم تو بہرحال فلسفہ نے کرہی لی۔ مضمون نگاری، تصنیف، تالیف اردو اور انگریزی دونوں میں جاری رہی، ہوتے ہوتے ۱۹۱۸ء آگیا۔ آخر سال تھا کہ ایک دوست کی تحریک پر انگریزی میں بودھ مذہب کی کتابیں دیکھیں اور دل کسی قدر ادھر مائل ہوا۔ معاً بعد ہندو فلسفہ کا مطالعہ شروع ہو گیا خصوصاً سربسنٹ اور بنارس کے مشہور فلسفی ڈاکٹر بھگوان داس کے انگریزی تراجم و تالیفات کے ذریعے سے۔ مغربیت، مادیت اور عقلیت کا جو تیز نشہ سوار تھا، وہ بتدریج اترنے لگا اور دل اس کا قائل ہو گیا کہ مادی اور حسی دنیا کے علاوہ بھی کسی اور عالم کا وجود ہے خصوصاً گیتا کا انگریزی ایڈیشن (مسز بسنٹ کا ترجمہ) اس حیثیت سے اکسیر ثابت ہوا۔ خدا کا نام اب قابل مضحکہ نہ رہا۔ روح اور روحانیت کے الفاظ سے نفرت و بیزاری دور ہو گئی۔ ہاں اسی درمیان میں مولانا شبلی کی سیرۃ النبیؐ کی جلد اول شائع ہو چکی تھی۔ اسے خوب جی سے پڑھا تھا۔ اور اس سے بھی ایسا اثر قبول کیا تھا صاحب سیرۃ کی رسالت پر ایمان تو ابھی دور کی چیز تھی، لیکن مارگولیس وغیرہ کے اثر سے (نعوذ باللہ) جو ایک خداع اور خونخوار سردار کا تصور قائم ہو گیا تھا۔ آنکھوں سے یہ زنگ اسی سیرۃ کے مطالعہ کی برکت سے کٹ چکا تھا اور اس کی جگہ ایک خوش نیت مصلح قوم کے تخیل نے لے لی تھی۔

اب دل مسلمان صوفیہ کے اقوال و احوال میں بھی لگنے لگا تھا۔ کشف و کرامت کے ذکر پر اب یہ نہ ہوتا کہ بے ساختہ ہنسی آجاتی بلکہ زبانیں اس قسم کے ملفوظات و منقولات کی رہنے لگی۔ فارسی اور اردو کتابیں بہت سی اس سلسلے میں پڑھ ڈالیں مسلمان تو ابھی بھی نہ تھا لیکن طغیان و عدوان کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ محض کتابوں کے سلسلہ میں محض شخصیتوں کا ذکر یقیناً بے محل ہے۔ لیکن اتنا کہے بغیر آگے بڑھا نہیں جاتا کہ اس دور میں دو یا تین زندہ ہستیاں بھی ایسی تھیں جن سے طبیعت رفتہ رفتہ اور بہت سرسری رفتار سے سہی، لیکن بہرحال اصلاحی ہی اثر قبول کرتی رہی۔ ایک اردو کے مشہور حکیم و ظریف شاعر اکبر الٰہ آبادی ہیں۔ دوسرے کامریڈ کے اڈیٹر اس وقت کے "مسٹر" اور اسی درمیان میں "مولانا" ہو جانے والے محمد علی ان دو کے بعد ہلکا ہلکا اثر مولانا حمیدالدین مفسر قرآن کا بھی پڑتا رہا۔

۱۹۱۹ء قریب ختم تھا کہ ایک عزیز کے پاس مثنوی معنوی (کانپور کی ایڈیشن کے چھ ضخیم دفتر) دکھائی دیے (اللہ رحمت اللہ علیہ کی تربت پر اپنی رحمت کے پھول برسائے) کاغذ، کتابت، طباعت کے ہر جلد محاسن ظاہری سے آراستہ، حاشیہ نہایت مفصل۔ چند سال ادھر توجہ بھی نہ کرتا۔ لیکن اب زمین پوری طرح تیار ہو چکی تھی۔ معدہ کو غذا گھنٹہ اور منٹ کی پابندی کے ساتھ ٹھیک وقت سے ملی۔ مطالعہ ذوق و شوق سے شروع کیا۔ اور ہر قدم پر شوق کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ الفاظ ملنے مشکل ہیں۔ جن میں اس ذوق و شوق کی کیفیت بیان کی جائے۔ فارسی استعداد واجبی ہی تھی۔ سلوک و معرفت کے نکات و اسرار الگ رہے۔ ظاہری لفظی معنی بھی صد ہا ہزار ہا اشعار کے سمجھ میں نہ آئے لیکن

ہٹاک کا یہ عالم کہ ایک شعر بھی چھوڑنے کو جی نہ چاہتا اور دل بے اختیار یہ چاہتا کہ جس طرح بھی ممکن ہو سارے دفتروں کو ایک دم سے چاٹ جاؤں، کھانے پینے، ہلنے جلنے تک کا ہوش نہ رہا، طبیعت بے قرار کہ کمرہ بند کیے بس اسی کو شروع سے آخر تک پڑھے چلا جاؤں، ہر ہر شعر تیر و نشتر بن کر دل کے اندر پیوست ہوتا جاتا اور تشکیک ارتیاب "عقلیت" ولا ادریت کے بادل ایک ایک کر کے سب چھٹتے چلے جاتے، حاشیے علمی رنگ کے دل کو زیادہ نہ بھاتے۔ خصوصاً شیخ ابن عربیؒ کے نظریات جہاں آجاتے تو وہاں دم اُلجھنے لگتا کہ یہ تو پھر وہی افلاطون وغیرہ کے طرز کی باتیں آگئیں جن سے گھبرا کر اور اُکتا کر میں بھاگا تھا حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے چھوٹے سادے اور پُر مغز حاشیے جہاں نظر پڑ جاتے، طبیعت پھڑک جاتی اور دل گواہی دے اُٹھتا کہ بے شک یہ قول ایسے ہی کا ہو سکتا ہے۔

مولانا نے حضرت رسالت کے باب میں کہا ہے کہ اس پر کسی معجزہ یا خارق عادت سے دلیل خارجی لانے کے کیا معنی پیمبر کی تو ہر ہر چیز بجائے خود ایک معجزہ ہوتی ہے۔ ع

روے و آواز پیمبر معجزہ ست

بس اپنا بالکل یہی حال خود مثنوی سے متعلق تھا۔ ہر شعر خود پکار کر شہادت دے رہا تھا کہ میں سچے ہی کی زبان سے نکلا ہوں، کسی اور دلیل و بُرہان کی حاجت ہی نہ تھی۔ مثنوی کا مطالعہ ہفتوں نہیں، مہینوں مسلسل جاری رہا، اور اس ساری مدت میں ایک نشہ سا سر پر سوار رہا، اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے بس اسی کی دُھن۔ اسی عالم میں کہیں مر گیا ہوتا۔ تو عجب نہیں کہ نکیرین کے سامنے مذہب کے سوال پر جواب زبان سے یہی نکلتا کہ،

"وہی مذہب ہے جو مولانائے روم کا مذہب تھا"

قرآن اور رسالت تک پر ابھی ایمان پختہ نہ تھا، بس دلیل سب سے بڑی یہی تھی کہ جب صاحب مثنوی اس پر ایمان رکھتے ہیں تو کیوں نہ یہ دین سچا ہو گا۔

غالباً اگست ۱۹۲۰ء تھا کہ ایک عزیز کے پاس مولوی محمد علی لاہوری کا انگریزی ترجمۂ القرآن پڑھنے میں آیا اور طبیعت نے اس سے بھی بہت گہرا اور اچھا اثر قبول کیا، مغربی راہ سے آئے ہوئے بیسوں شبہات و اعتراضات اس ترجمہ و تفسیر سے دور ہو گئے، اور یہ رائے اب تک قائم ہے۔ اس بیس سال کے عرصہ میں خامیاں اور غلطیاں بہت سی (بلکہ بعض جگہ تو ایسی جسارتیں جن کے ڈانڈے تحریف سے مل جاتے ہیں) اس ترجمہ و تفسیر کی علم میں آچکیں، لیکن انگریزی خوانوں اور مغرب زدوں کے حق میں اس کے مفید اور بہت مفید ہونے میں اب بھی ذرا کلام نہیں۔ ہدایت کا واسطہ جب اللہ کی حکمت صریح غیر مسلموں کے کلام کو بنا دیتی ہے، تو یہ تو بہر حال اللہ کے کلام کا ترجمہ و حاشیہ ہے۔ مترجم کی بعض اعتقادی غلطیوں کی بنا پر ان کی ساری کوششوں سے بدظن ہو جانا قرین انصاف و مقتضائے تحقیق نہیں۔

نیم مسلمان ہو چکنے کے بعد پھر پورا مسلمان بن جانا اور ادخلوا فی السلم کا فتہ کے تحت میں آجانا کچھ زیادہ دشوار نہ تھا اقبالؒ کی اُردو اور فارسی نظمیں، محمد علیؒ کی نظمیں اور تحریریں (خصوصاً زمانہ نظر بندی ۲۱-۱۹۲۳ء کی) سب اپنا اپنا کام کرتی رہیں دل میں گھر کرتی گئیں۔ یہاں کہ مکتوبات مجددیؒ نے اس پر پوری مہر لگا دی۔ مکتوبات کا جو امر تسری نسخہ متعدد جلدوں میں پیش نظر رہا، وہ اپنی صفائی خوشنمائی اور کثرت حواشی کے لحاظ سے گویا مثنوی ہی کے اسی کانپوری ایڈیشن کی ٹکر کا تھا اور اثر میں شاید اس سے کچھ ہی کم۔ مثنوی سے اگر طبیعت میں ایک شورش اور تڑپ پیدا ہو گئی تھی۔ تو اس میں سکون اور ٹھہراؤ مکتوبات ہی کی برکت سے حاصل ہوا۔ درمیان میں عطارؒ، سنائیؒ، جامیؒ، شیخ جیلانیؒ، غزالیؒ، سہروردیؒ وغیرہم اکابر سو خ کی خدا معلوم کتنی کتابیں نظم و نثر کی نظر سے گزر گئیں لیکن دل پر نقش انہیں دو کتابوں کا سب سے زیادہ گہرا بیٹھا رہا پہلے مثنوی اور پھر مکتوبات حالانکہ سمجھ میں دونوں کا بڑا حصہ اس وقت تو کیا آتا اب تک نہیں آیا۔

حال کی انگریزی کتابوں میں ایک قابل ذکر کتاب اور یاد پڑ گئی۔ یہ نو مسلم یورپین لیوپولڈ یس محمد آسد کی (Islam on the Cross Road) دیکھنے میں چھوٹی سی، معنویت کے لحاظ سے بہت بڑی اور گہری ہے، ہر انگریزی خواں کے ہاتھ میں جانے کے قابل۔ بڑی مسرت اسے پڑھ کر یہ ہوئی کہ جو خیالات تہذیب فرنگ و اسلام سے متعلق پہلے سے اپنے قائم ہو چکے تھے۔ یہ مغربی مفکر بھی گویا تمام تر انہیں کی تائید کر رہا ہے۔

۱۹۲۶ء تھا کہ ایک دوست کی زبانی سے پہلے رسائی مولانا تھانوی مدظلہ کے مواعظ اور بعض رسائل سلوک تک ہوئی۔ اور پھر ۱۹۲۸ء میں خود مولانا اور ان کی دوسری تصانیف تک، اس نے حقائق دینی و عرفانی کا ایک نیا عالم نظر کے سامنے کر دیا۔ اب ادھر چند سال سے مسلسل شغل اس بے علم و نااہل کا خدمت قرآنی کا ہے۔ اپنا تجربہ یہ ہے کہ دوسرے حضرات کے ہاں اکثر اوراق پر اوراق اُلٹ جانے سے بھی وہ گوہر گنجے نہیں ملتے جو حضرت تھانوی کے یہاں چند سطروں کے اندر میسر آجاتے ہیں۔ معاصرت کا ابتلاء عجیب ابتلا ہے۔ اللہ سب کو محفوظ رکھے۔ جو دیکھنا نہیں چاہتے اُنہیں آنکھیں پھیر کر دکھایا بھی کیسے جا سکتا ہے؟ — اور یہ صرف تفسیر یا دوسرے علوم ظاہری ہی پر موقوف نہیں ہے۔ علوم باطنی میں تو پایہ شاید کچھ بلند تر ہی نکلے۔ ع

اے لقائے تو جواب ہر سوال
مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

محض کتابوں کی تعداد ہے اتنی بڑی کہ سب کی تفصیل لکھی جائے، تو بجائے خود ایک کتاب تیار ہو جائے، مختصر بلکہ مختصر تر یہ کہ حدیث میں صحیح بخاری اور اس کی شرح فتح الباری نے آنکھیں کھول دیں اور فقہ میں شرح صدر کے لئے ائمہ حنیفہ کے اقوال، بالکل کافی ثابت ہوئے، فہم قرآنی میں معروف و متداول تفسیروں کو معین و مفید پایا۔ ان کی بے وقعتی خود اپنی محرومی کی دلیل ہے۔ ان کتابوں کا نام اس بے تکلفی سے لے رہا ہوں کہ گویا سب کو رواں اور صحت اعراب کے ساتھ پڑھ سکتا ہوں۔ حالانکہ یہ ذرا بھی صحیح نہیں، لغات شروح، تراجم کے سہارے کام کسی نہ کسی طرح بس چل ہی جاتا ہے، لغت میں تاج العروس اور پھر لسان العرب کے ساتھ اور لغت قرآنی میں مفردات قرآنی کے ساتھ سب سے زیادہ لگا لپٹا رہتا ہوں۔

انسانی کتابوں کے ساتھ اور ان کے ضمن میں اللہ کی کتاب کا نام لے آنا اور دونوں میں موازنہ و تقابل کی ٹھہرانا بڑی ہی بدمذاقی ہے اور پھر محض کتابوں میں "کتابوں" (صیغۂ جمع) کا لفظ خود اس پر دلالت کرتا ہے کہ الکتاب موضوع سے بالکل خارج ہے۔

بقیہ صفحہ ۶

وقت کی قیمت کا احساس پیدا کرتا تھا بارہا ایسا ہوا کہ میں جب ان کی خدمت میں دریاباد حاضر ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے اپنے روزانہ کام کے اوقات میں کچھ وقت کا اضافہ کر کے آپ سے ملاقات اور گفتگو کے لئے یہ وقت بچایا ہے۔

تحریک ندوۃ العلماء اور اس کے اس دارالعلوم سے مولانا کو قلبی تعلق تھا وہ عرصہ سے اس کے مجلس انتظامی کے ایک موقر اور قابل احترام رکن رہے۔ مولانا شبلی سے بھی انہوں نے استفادہ کیا اور مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالباری ندوی سے ان کے برادرانہ اور دوستانہ مراسم تھے ندوہ کی فکر اور تخیل سے ان کو جذباتی تعلق تھا، اگر کسی کو کوئی شگفتہ تحریر ان کی نظر سے گزرتی تو وہ اسے ندوی القلم کہتے تھے۔

وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے باقاعدہ طالب علم نہیں تھے لیکن ندوی برادری سے ان کے گہرے مراسم اور فکر و عمل کی ہم آہنگی کی وجہ سے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے اپنے ایک مضمون میں انھیں فضلائے ندوہ میں شامل کر لیا اور دو مرتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ابنائے قدیم کے جلسہ کی صدارت کا انہیں شرف بخشا گیا۔ ندوۃ العلماء کے مجلس انتظامی کے جلسہ میں وہ بڑی پابندی سے شرکت فرماتے۔ اور اس علمی خاندان میں اس آخری دور میں انکی حیثیت ایک قابل احترام بزرگ سرپرست کی سی ہو گئی تھی۔

پرنٹر، پبلشر، مسئول سید محمد حسنی نے جے۔ کے آفسیٹ پرنٹنگ پریس دہلی سے طبع کرا کر، دفتر "تعمیر حیات" ندوہ لکھنؤ سے شائع کیا۔
اڈیٹر: اسحٰق جلیس ندوی
کتابت: جلال الدین بستوی ندوی

علالت سے وفات تک

از: حکیم عبدالقوی دریابادی

عم محترم مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر "صدق جدید" پر فالج کا حملہ ۱۴ مارچ ۱۹۷۴ء کو داہنی جانب ہوا تھا۔ ۶ جنوری ۱۹۷۷ء پنجشنبہ کو صبح ۴ بجے وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وفات سے ڈھائی تین ہفتہ قبل مرض کا نیا حملہ لکھنؤ میں ہوا اس سے زبان اور دماغی قوتوں پر بہت بڑا اثر پڑا، گفتگو بہت مشکل سے سمجھ میں آتی تھی اور دوسروں کی بات بہ مشکل سمجھتے تھے اس سے قبل غذا معمول کے مطابق تھی اب وہ بھی بہت گھٹ کر برائے نام رہ گئی تھی، اجابت بھی کئی کئی روز دواؤں کے استعمال کے باوجود نہیں ہوتی تھی۔ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں تین ساڑھے تین بجے شب کو گرنے کے باعث کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اس حادثہ نے انہیں اور زیادہ معذور کر دیا تھا۔ اب وہ پلنگ کے بجائے ایک چوبی تخت پر اس حال میں لٹا دیے گئے تھے کہ داہنی ٹانگ میں پلاسٹر چڑھا ہوا تھا اس جانب وہ کروٹ بھی نہیں لے سکتے تھے یا تو لیٹے رہتے یا تکیوں کے سہارے کسی حد تک بیٹھے رہتے۔ وفات سے چند روز قبل پلاسٹر کھول دیا گیا تھا مولانا کو تخت سے اُتر کر چلنے کی بڑی تمنا تھی لیکن افسوس جس وقت پلاسٹر کھلا تو مرض کے اثر سے اس حد تک غفلت طاری ہو چکی تھی کہ اس کا احساس گویا انہیں ہوا ہی نہیں اس عالم میں اکثر اوقات وہ پاس آنے والوں کو پہچاننے سے قاصر رہتے لیکن ندوہ سے انہیں دلی تعلق تھا شاید اس کا اثر تھا کہ اس زمانہ میں مولوی محمد میاں الحسنی (ڈاکٹر عبدالعلیؒ کے صاحبزادہ) جب عیادت کو آئے تو انہیں بخوبی پہچان لیا اور بہت مسرت ظاہر کی اور چند باتیں سننے والوں کی سمجھ میں آگئیں، لیکن تھوڑی دیر کے بعد اس ملاقات کو بالکل بھول گئے۔ وفات سے تقریباً ۳ دن قبل بالکل غفلت طاری ہو گئی اور غذا بھی بالکل ترک ہو گئی اجابت تو بند تھی پیشاب جس کی کثرت سے وہ پریشان رہتے تھے بہت کم ہو گیا اور وفات سے ۲۰، ۲۲ گھنٹہ قبل بالکل ہی بند ہو گیا۔ متعدد دوائیں دی گئیں جن کا کوئی اثر نہ ہوا اور ساتھ ہی نمونیا کی شدید علامات بھی نمایاں ہو گئیں۔ علاج ہومیو پیتھک تھا۔ ڈاکٹر اشتیاق احمد صاحب قریشی بڑی توجہ اور دلسوزی کے ساتھ علاج کر رہے تھے۔ آخری چند دنوں میں ایلو پیتھک علاج بھی رہا اور وہ انجکشن لگے جن سے شروع مرض میں نمایاں افاقہ ہوا تھا لیکن اس مرتبہ وہ بھی محض بے اثر ثابت ہوئے ڈاکٹری دوا حلق سے بہ مشکل اترنے لگی اس حالت میں ہومیو پیتھک دوا دی جانے لگی اس غفلت کی حالت میں آخری شب میں بار بار ہاتھ کانوں تک لیجاتے اور نیچے لے آتے گویا نماز کی نیت کر رہے ہوں وفات سے کچھ دیر قبل تک یہی سلسلہ رہا اسی شب ۷-۸ بجے کے درمیان کمرۂ علالت میں تیمار داروں کو غیر معمولی اور عجیب قسم کی خوشبو محسوس ہوئی اور کچھ دیر تک محسوس ہوتی رہی ایسا ہی چند روز قبل ٹھیک اسوقت ہو چکا تھا۔ چہار شنبہ کو ۹ بجے کے قریب مہتمم دارالعلوم دیوبند مولانا قاری محمد طیب صاحب جو لکھنؤ تشریف لائے ہوئے تھے شدت علالت کی اطلاع پا کر عیادت کے لئے آئے لیکن مولانا اسوقت بالکل غافل تھے اس سے قبل انھیں مولانا محمد طیب صاحب کی ملاقات کی بڑی تمنا تھی مولانا دریابادی کی مایوس کن حالات دیکھ کر مولانا طیب صاحب بہت متاثر ہوئے، اس سے قبل کئی ماہ ہوئے وہ عیادت کے لئے مولانا کے وطن دریاباد تشریف لے گئے تھے اور اس سے مولانا کو بڑی خوشی ہوئی اس کا ذکر انہوں نے صدق جدید کے ایک نوٹ میں کیا تھا ٹھیک سوا چار بجے (عموماً اس وقت وہ اس بیماری میں بھی بیدار ہو کر نماز تہجد ادا فرماتے تھے اور اسکے بعد تھوڑا بہت کوٹھے کی چھت پر ٹہلتے تھے) روح نے جسم سے مفارقت کی۔ حادثہ کی اطلاع مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کو کرائی گئی مولانا کی وصیت میں نماز جنازہ پڑھانے والوں میں پہلا نام انہیں کا تھا۔ نماز جنازہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے وسیع میدان ظہر کی نماز کے بعد ہوئی ندوہ کے طلباء کی بہت بڑی تعداد جنازہ کو مکان (خاتون منزل پرانا ندوۃ العلماء) سے دارالعلوم ندوہ تک لانے میں شریک رہی یہاں سے جنازہ بس کے ذریعہ حسب وصیت وطن دریاباد ضلع بارہ بنکی لے جایا گیا اور مکان سے متصل مولانا کے مورث اعلیٰ حضرت مخدوم آبکشؒ کی قبر کے متصل دفن کیے گئے تدفین میں ندوہ کی طرف سے مولانا محمد رابع ندوی اور چند حضرات نے بھی شرکت کی۔ دریاباد میں جس وقت جنازہ پہونچا دریاباد اور قرب و جوار کے لوگوں کا بہت بڑا مجمع جس کی مثال قصبہ کی تاریخ میں مفقود ہے، موجود تھا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء سے مولانا کو خاص تعلق تھا وہ علالت میں بھی قائم رہا۔ مرض کے ابتدائی حملہ کے چند روز بعد دارالعلوم کی مجلس انتظامیہ (جس کے صدر نشین مولانا ہی تھے) کا جلسہ لکھنؤ میں ہوا مرض کی اس حالت میں بھی مولانا نے اس کی شرکت کے لئے لکھنؤ کا سفر کیا مولانا کی بیماری کے باعث مولانا علی میاں نے یہ جلسہ دارالعلوم کے بجائے مولانا کی قیامگاہ پر مولانا کی صدارت میں کیا اسکے بعد مجلس انتظامیہ کے دو جلسے دارالعلوم میں ہوئے ان میں بھی مولانا انتہائی ضعف کے باوجود تشریف لائے اور جب تک جلسہ جاری رہا وہیں ٹھہرے رہے۔

۱۹۷۵ء میں ایک بار تھوڑی دیر کے لئے دارالعلوم کے کتب خانہ میں تشریف لائے بعض کتابیں نکلوا کر دیکھیں اس سے قبل جشن ندوہ میں ایک دن شرکت فرمائی۔ مولانا مرحوم کو اس کی بڑی تمنا اور آرزو تھی کہ ان کی وفات ذی الحجہ کے مقدس دنوں میں ہو۔ علالت کے کچھ عرصہ بعد مرض کا اثر دماغ پر بہت زیادہ تھا مختصر مضمون لکھنا روز بروز مشکل سے مشکل تر ہوتا جاتا تھا اگر لکھتے تو اس کا پڑھنا دشوار ہو جاتا اس لئے انہوں نے اخبار "صدق" میں قلم رکھ دینے کا اعلان کر دیا تھا لیکن ماہ اکتوبر ۱۹۷۶ء تک ہر ہفتہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے۔ سچی باتیں بھی لکھیں اور نوٹ بھی اور بعض مضامین بھی جدید مطبوعات پر تبصرے بھی آخری تبصرہ ان کے قلم سے مولوی محمد الحسنی کی مرتب کردہ کتاب روداد چمن (جو جشن ندوہ کے حالات پر مشتمل تھا) پر تھا جس کے بعض جملے مرتب کتاب کے لئے بڑے حوصلہ افزا سارٹیفکیٹ کی حیثیت رکھتے تھے دوران علالت مولانا اپنے آخری وقت کو اکثر یاد کرتے تھے اور اس سلسلے کی ہدایات بھی دیتے رہتے تھے اسی زمانہ میں کئی بار خواہش ظاہر کی تھی کہ اگر مولانا منظور نعمانی صاحب اس وقت موجود ہوں تو غسل وہی دیں لیکن افسوس جس وقت حادثہ پیش آیا مولانا نعمانی صاحب بھی چلنے پھرنے سے بالکل معذور ہو چکے تھے۔

وفات سے چند ماہ قبل مستقل قیام دریاباد کے بجائے لکھنؤ ہی میں تھا آخری بار دریاباد ماہ رمضان گزارنے گئے تھے اور وہاں گھر پر آخری بار تراویح میں پورا قرآن پاک ایک دریابادی ندوی (حافظ عبدالعلی ندوی) نے انھیں پورے مہینہ بھر سنایا اختلاط اور ضعف کے باوجود مولانا نے پورے مہینہ نماز تراویح میں شرکت کی کمزوری کے باعث نماز بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ نماز باجماعت کی پابندی ہڈی ٹوٹنے کے حادثہ سے قبل تک برابر رہی گھر پر نماز ہوتی تھی زمانہ قیام دریاباد مغرب کی نماز مسجد میں پڑھتے تھے لیکن آخر میں ضعف کے غلبے اور شدت بول کے باعث وہاں جانا ترک ہو گیا تھا۔ علالت کے دوران حافظہ پر بہت خراب اثر پڑا تھا بار بار اس پر حسرت، رنج و افسوس ظاہر کرتے تھے روزانہ شام کو اور مغرب کے درمیان ملاقات کا دستور غفلت طاری ہونے سے قبل تک برابر رہا۔

[illegible]

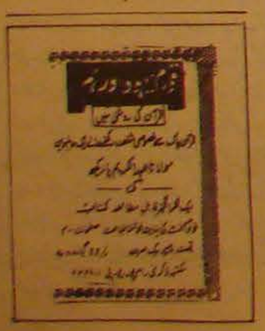

ندوۃ العلماء

اور

مولانا دریابادیؒ

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ ضابطے سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فاضل و تعلیم یافتہ نہیں تھے خوش قسمتی سے اگر ایسا ہوتا تو یہ اس شہرۂ آفاق تعلیم گاہ کے لئے باعث نازش و افتخار اور اس کے ذمہ داروں کے لئے سرمایۂ مسرت و انبساط ہوتا۔

لیکن ان کے اس درسگاہ اور اس کے فضلاء و ابنائے قدیم، بلکہ اس کے ایک عظیم رہنما اور اس کے مایۂ ناز فرزندوں کے "معلم اوّل" علامہ شبلی نعمانی سے ایسے گہرے اور مخلصانہ تعلقات و روابط رہے ہیں اور ان میں اور سید الطائفہ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی ندوی (سابق ناظم ندوۃ العلماء) سے ایسے عزیزانہ و برادرانہ تعلقات اور ایسی یگانگت و مودت رہی ہے کہ ان کو اس علمی و فکری خاندان کا ایک فرد اور بزم شبلی کا ایک رکن رکین کہنا صحیح ہوگا۔ ان کو اس درسگاہ سے اتنا دیرینہ تعلق رہ چکا ہے اور وہ سید صاحب، مولانا عبدالباری صاحب اور مولانا مسعود علی صاحب سے اس طرح شیر و شکر اور ندوے کی بہت سی خصوصیات کے اس طرح حامل رہے ہیں کہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کو (جن کی حیثیت ایک سرپرست خاندان کی سی تھی) یہ خیال ہوا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے باقاعدہ فارغ ہیں اور انہوں نے لکھنؤ میں اجلاس ندوۃ العلماء کے خطبۂ صدارت میں مولانا عبدالباری ندوی کے ساتھ انکا نام لیا) اسی بنا پر طلبۂ قدیم کی انجمن نے ان کو ایک مرتبہ اپنے سالانہ جلسہ کا صدر استقبالیہ اور ایک مرتبہ صدر اجلاس منتخب کیا جو نہ ان کی طرف سے صرف اعتماد و استناد بلکہ یگانگت و اتحاد کا اعلان تھا، گویا ان کو اعزازی طور پر ندوی تسلیم کر لیا گیا اور ابنائے قدیم نے اپنی مہر تصدیق اس پر ثبت کر دی۔

ان دو تاریخی موقعوں پر مولانا نے جو خطبے پڑھے وہ ان کی طرز تحریر اور ادب و انشاء کی بہترین خصوصیات کے حامل تھے۔ وہی زور قلم، وہی آمد، بے تکلف مسجع فقرے جو آورد سے خالی ہیں، وہی ادبی و تاریخی تلمیحات اور رعایتیں جو ان کی انشاء پردازی کا جز بن گئی ہیں، وہی اس تحریک و ادارے کی افادیت اور اس کے بانیوں کی اصابت رائے اور فراست پر یقین، جو ان کے قلبی تعلق اور ذہنی اتحاد کی دلیل ہے۔ انکی بہت سی تحریروں کی طرح ان کو جب پڑھئے ایک لطف تازہ اور ایک لذت بے اندازہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریریں برسوں کی پرانی نہیں، شاداب پھولوں کی طرح اب بھی ان میں تازگی و رعنائی جوانی و برنائی ہے۔!!

ایک نام کے ندوی کا پیام

ندوہ کی برادری کے نام

(خطبۂ صدارت استقبالیہ جلسۂ طلبۂ قدیم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

۲۴ر دسمبر ۱۹۳۲ء ـــــ از: عبدالماجد)

بزرگو اور عزیزو، بڑے اور چھوٹے بھائیو!

اللہ کی رحمت اور سلامتی ہم پر اور آپ پر، آنے والوں پر اور ان پر جو دُور دُور سے کھنچ کھنچ کر زحمتیں اٹھا کر آئے اور ان پر جنھوں نے پرانی یاریوں اور دوستیوں کی کمندیں پھینک پھینک کھینچا اور گھسیٹا! مسافتوں کی دوری قلوب کی کشش کے سامنے گرد، موسم کی سردی، دلوں کی گرمجوشیوں کے آگے سرد! آج شرق و غرب، شمال و جنوب میں خزاں کا پہرہ۔ اس چار دیواری کے اندر فصل بہار کا دُور دَورہ۔ ایک عالم اپنے مصائب میں مبتلا و مایوس، آپ کی محفل مبارک اور صدر محفل "مسعودؔ"

رحمت و سلامتی آج کے مہمانوں پر اور میزبانوں پر۔ اس مکان کے پُرانے مکینوں پر، اور ان کے نئے جانشینوں پر۔ رحمت ان پر جو یہاں رہے اور پلے، پڑھے اور بڑھے، سیکھے اور کھیلے۔ رحمت ان پر جنھوں نے رکھا اور پالا، پڑھایا اور بڑھایا، سکھایا اور کھلایا۔ بگڑے ہوئے آئے تھے وہ یہاں آکر بنے اور سدھرے، جو کچھ نہ تھے وہ یہاں رہ کر خدا جانے کیا کچھ ہو گئے۔ رحمتیں اس مکان کے در و دیوار پر۔ رحمتیں اس چمن کے صحن و سبزہ زار پر، رحمت اُن پر جنھوں نے اس رحمت و سلامتی کی یہ سبیل لگا دی۔ رحمت اس کے پینے والوں پر، رحمت اس کے پلانے والے پر، رحمت جوانانِ جرعہ نوش پر۔ رحمت پیرانِ مے فروش پر۔!

برادران کرام! کہاں مجلس استقبالیہ کی صدارت کا بارِ گراں کہاں اس عاجز و ضعیف کا یہ دوش ناتواں سے

اس حوصلے کو دیکھیے اور ہم کو دیکھیے

لیکن یہ ظلوم و جہول مخلوق وہ ہے جو امانتِ الٰہی تک پر لپک کر دوڑی اس کا ایک گمنام فرد اپنے بزرگوں اور عزیزوں کا بخشا ہوا منصب قبول کرنے پر طوعاً نہ سہی کرہاً اگر آمادہ ہو گیا تو حیرت کیوں کیجئے، داد مجلس استقبالیہ کے اس حسن انتخاب کو دیجئے کہ استقبال کے لئے آگے بڑھایا بھی تو کس کو؟ اس کو جو نہ "حال کا سرمایہ دار ہے نہ قال" کا۔ نہ علوم کا نہ اعمال کا۔ ایک تہی مایہ و بے بضاعت شخص جو اُلٹا ماضی کے گوشوں میں لٹکا اور قدامت کے زاویوں میں اٹکا ہوا ہے۔ دستور ہے کہ صدر اپنی عزت افزائی پر شکریہ کے الفاظ زبان سے نکالتا ہے، یہاں اپنی نا اہلی اور بے کمالی کی پوری پیمائش کے بعد یہی غنیمت ہے کہ مجلس استقبالیہ کی اس ستم ظریفی پر زبان فاش و برملا نہیں کُھل رہی ہے۔

بزرگو اور عزیزو! دنیا نے ہمیشہ درختوں کو اُن کے پھلوں ہی سے پہچانا ہے۔ دارالعلوم درخت ہے تو آپ اسکے پھل۔ ندوہ کی اچھائی بُرائی کے اور کوئی معنی ہی نہیں، بجز اس کے کہ آپ اچھے ہیں یا خدا نخواستہ بُرے۔ رائے نہ کوئی کاغذی نصاب درس کو پڑھ کر قائم کرے گا، نہ مٹی و چونے کے بنے ہوئے در و دیوار کو دیکھ کر۔ آپ اچھے تو ندوہ اچھا، آپ نیک تو ندوہ نیک نام، موجودہ طلبہ صرف تخم ہیں جو زمین میں ڈالے گئے ہیں یا قلمیں ہیں جو باغ میں لگائی گئی ہیں۔ طلبہ کی ساری آنے والی نسلیں آپ ہی کے رنگ میں اپنے کو رنگیں گی، آپ ہی کے نقش قدم پر چلیں گی، آپ ہی کے قالب میں ڈھلیں گی۔ دارالعلوم ایک دینی درسگاہ ہے اور ندوہ ایک دینی مجلس مقصد دین ہی کی خدمت ہے نہ کہ دنیا کا جاہ و حشم مال و منال، منصب اور عہدے ڈگریاں اور ڈپلومے لیکن دین کی خدمت کے طریقے مختلف ہیں اور راستے متعدد۔ ضرور نہیں کہ ہر مخلص خادم کی راہ وہی ہو جو دوسرے اہل اخلاص اپنے لئے اختیار کر چکے ہیں اور ہر شاگرد اپنے استاد کا ہو بہو چربہ فقہاء نے اگر اپنے طرز پر دین کی خدمت کی تو محدثین نے اپنے رنگ میں صوفیہ نے دوستوں کے دلوں کو گرمایا، متکلمین نے دشمنوں کے سروں کو کچلا، کوئی جہاد و قتال کا مرد میدان، تو کوئی رہبر اُمت و ترجمان القرآن! جنت کی خریداری کسی نے کی خون کے فواروں میں نہا نہا کر، تو کسی نے کاغذ کے صفحات پر خون جگر کے قطرات بہا بہا کر، ندوہ جس وقت عالم وجود میں آیا دارالعلوم کی بنیاد جس دم پڑی دیوبند کا قابل صد قدر اور مستحق ہزار فخر مدرسہ موجود تھا رامپور تھا، سہارنپور تھا، فرنگی محل تھا اور اور دینی و علمی مرکز موجود تھے ندوہ کی ضرورت پھر بھی باقی تھی ندوہ خود مستقل اور نئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے آیا کسی سابق ادارہ کی شاخ بننے نہیں آیا۔ حسن بصری و جنید بغدادی، بخاری و مسلم، ابو حنیفہ و شافعی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین سب کے دور کے ابو الحسن اشعری اور ابو بکر باقلانی، ابو حامد غزالی اور فخر الدین رازی، شاہ ولی اللہ دہلوی اور رحمت اللہ مہاجر مکی

سلہ صدر جلسہ مولوی مسعود علی ندوی (مہتمم دارالمصنفین تھے)

کی جگہ خالی تھی ـــــ تھی لیکن بوجہ تک خالی نہیں رکھی جا سکتی تھی۔

تشکیک و ارتیاب، دہریت و الحاد، فرنگیت و مادیت، دجالیت و یاجوجیت کا بے پناہ سیلاب بڑھا چلا ہوا آ رہا تھا، مبارک ـــــ اس کو دیکھا، بھانپا، مبارک تر تھے وہ ہاتھ جو فوراً بند کے باندھنے میں لگ گئے فرق اسلامی کے اب باہمی تفرقے تقویم پارینہ ہو چکے تھے۔ اب معاملہ ہاتھ میں لگی ہوئی پھانسوں اور پیر میں چبھے ہوئے کانٹوں کی حد سے گزر چکا تھا اب وقت دل و دماغ اور جگر، اعضائے رئیسہ کے بچاؤ کا تھا۔ اب حملہ اس عظیم الشان ہیبت ناک قوت کا شروع ہو چکا تھا جس کی براہ راست شعلہ فشاں توپوں کا حملہ اور ہدف اب دین کے سفینے تھے اور اہل ایمان کے سینے۔ یاجوجیوں کا غول وہ ہے جسے نہ شیعوں کی مروّت نہ معتزلی کی رعایت نہ مقلد و غیر مقلد کے درمیان تفریق نہ وہابی، بدعتی کا امتیاز۔ آج علم غیب رسول اور امکان کذب باری پر بحث کون کرتا ہے؟ آج ان راستوں سے کون آپ کی ایمان کی دولت پر ڈاکہ ڈالتا ہے! اب تو جو سوالات تمسخر اور استہزاء، طنز و تحقیر کے ساتھ پیش ہو رہے ہیں وہ اس قسم کے ہیں کہ (نعوذ باللہ) یہ کیسا خدا ہے جس نے نیکی کے ساتھ بدی، خیر کے ساتھ شر کو بھی پیدا کیا ہے؟ کیسے انبیاء تھے (معاذ اللہ) جن سے بڑھ بڑھ کر معجزات آج کی سائنس دکھا رہی ہے؟ خالق کے وجود کا ثبوت کیا ہے؟ اور کسی واجب الوجود کا وجود سرے سے ہے بھی یا نہیں؟ کہیں ہمارے واہمہ نے خود ہی تو "خالق" کی خلاقی نہیں کر لی ہے یہ وہ حملے ہیں جو شاخوں پر نہیں اصل پر، مذہب کے قلب پر دین کی اساس پر ہو رہے ہیں اور ہر راہ سے ہو رہے ہیں۔ تاریخ کی راہ سے، ادب کی راہ سے، سیرت کی راہ سے شعر کی راہ سے، افسانہ کی راہ سے، صحافت کی راہ سے فلسفہ کی راہ سے، سائنس کی راہ سے غرض ہر سمت سے ہر راہ سے من کل حدب ینسلون، سارے دوسرے فتنے اگر محض فتنے تھے تو یہ عطر فتنہ، ایک قیامت، اللہ تعالیٰ کی بے شمار رحمتیں اور بے حساب برکتیں نازل ہوں، مولانا شاہ محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ پر کہ خدمت اسلام کے ولولہ اور حمایت دین کی تڑپ سے بے قرار ہو کر مجلس ندوہ کا سنگ بنیاد رکھ دیا۔ رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہو ان کے سارے مخلص رفیقوں پر، کارکنوں پر، مولانا شبلی پر اور ان تمام زندہ اور مرحوم حضرات پر جو من انصاری الی اللہ کی صدائے غیبی سُن کر اپنے حجروں سے دیوانہ وار نکل پڑے اور اسلام کی پکار پر جھپٹ جھپٹ کر بڑھے۔

دجال کی ذریت بڑھتی اور بڑھتی رہی یاجوجیت پھیلی اور پھیلتی رہی حکمت کاملہ کی مشیت کو جب نوح و ابراہیم خلیل یونس و موسیٰ کلیم اللہ کی مخلصانہ دعوتیں نہ روک سکیں تو ہم عاجز و ضعیف بے بنیان و بے سر و سامان ناتوانوں کی کیا حقیقت اور کیا بساط ہے لیکن میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ تکلف اور انکسار برطرف اس دور میں سب سے زیادہ مقابلہ اس فتنۂ عظمیٰ اور ورطۂ کبریٰ کا اہل سنت میں کس نے کیا۔ یہ سید سلیمان ندوی جو آپ کے سامنے موجود ہیں، ان سے بڑھ کر اس میدان کا کوئی سپاہی سارا ہندوستان اپنے طول و عرض میں دکھا سکتا ہے۔ الندوہ کی راہ سے معارف کی راہ سے قابل رشک "سیرۃ النبی" کی راہ سے خطبات مدراس کی راہ سے، اپنی صدہا تقریروں اور تحریروں کی راہ سے۔ اللہ کے دین کی جو خدمت اور ناموس رسولؐ کی جو نصرت اس ایک اللہ کے بندے نے اپنے مخصوص سنجیدہ و علمی رنگ میں کی ہے اس کی کوئی دوسری مثال آپ بڑی بڑی خانقاہوں میں گھوم گھوم کے بڑے بڑے مدرسوں میں تلاش و جستجو کر کے، بڑے بڑے جبّوں اور دستاروں کا جائزہ لے کر بھی بتا سکتے ہیں، معاصرت کا ابتلاء بھی عجیب ابتلاء ہوتا ہے۔ آج آنکھوں پر پردے جو بھی چاہے ڈال لے حق ہمیشہ زیر نقاب نہ رہے گا۔ "کل" انشاء اللہ آپ کی جماعت کے لئے فخر کرے گا کہ آپ نے ایک سید سلیمان کو پیدا کر دیا۔ اس سالار قافلہ کے ساتھ اس کے رفقاء کو بھی نظر انداز نہ کیجئے جس نے اسوۂ صحابہ کو مفصل اور دلکش انداز میں پیش کیا، جنھوں نے مہاجرین اور انصار اور خلفائے راشدین کی جیتی جاگتی تصویریں اپنے قلم سے کھینچ کر رکھ دیں اور جس فلسفی نے پہلے "مذہب و عقلیات" کا تحفہ پیش کیا اور پھر سیرت النبی جلد سوم میں معجزات پر فلسفۂ جدیدہ کی روشنی میں مقالہ لکھ کر اپنی ندویت کا حق ادا کر دیا۔ ان سب کو کوئی بھلانا چاہے بھی تو کیونکر بھلائے؟

مجھے بتایا جائے کہ بالکل جدید قسم کا علم کلام بجز ندوہ والوں کے اور کس نے پیدا کر دیا ہے، تاریخ، ادب، سیرت ہر شے کو کلامی رنگ میں رنگ دینا بجز آپ کی برادری کے اور کس کے حصہ میں آیا ہے؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات مبارکہ اور صحابہ کرام کے سوانح اس تفصیل، اس جامعیت اس استناد کے ساتھ اُردو ہی میں نہیں، میں کہتا ہوں کہ دنیا کی کسی زبان میں بجز آپ کی جماعت کے اور کون لایا ہے؟ آج ملک کا تعلیم یافتہ کس مذہبی ادارہ کے علماء سے سب سے زیادہ تسکین و تشفی پا رہا ہے؟ آپ کی برادری کے ان ارکان کا فیض ہندوستان کے تعلیم یافتہ گروہ تک محدود نہیں رہا، مصر اور ترکی اور افغانستان نے اور جاوا اور سماٹرا اور خود یورپ کا علمی طبقہ آپ کے ندوہ کے انوار سے، دارالمصنفین اور معارف کی راہ سے برابر مستنیر ہو رہا ہے۔

پھر عالمگیر اور رقعات عالمگیر کے متعلق جدید و عمیق تحقیقات جو آپ ہی کے ایک فرد نے کی ہے، سطحی نظر کو دین کی راہ سے الگ معلوم ہوگی۔ لیکن اس نظر میں ذرا عمق پیدا کر لیا جائے تو ایک مسلمان اور پھر اورنگ زیبؒ جیسے متقی و دیندار فرماں روا کی نصرت، حمایت، عین دین ہی کی نصرت و حمایت معلوم ہوگی۔ بلا واسطہ نہ سہی، بالواسطہ سہی کہ اللہ والوں سے تعلق رکھنا اللہ ہی سے تعلق رکھنے کے حکم میں ہے اور سلسلۂ دارالمصنفین سے "ارض القرآن" پر آپ ہی کے انوار کی جو شعاعیں پڑ رہی ہیں کوئی ان کی طرف سے آنکھیں کیونکر بند کرے! ایک نہیں ماشاء اللہ تین تین ندوی عزیز وہاں جس طرح اپنے کو سنن و احادیث و سیر، بیہقی و ابن حجر کی خدمات کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں اور جس طرح ان کے ہاتھوں یہ دولت بے بہا مصر و حجاز اور تمام ممالک اسلامیہ کے ہاتھ لگ رہی ہے ان کی طرف سے کوئی اپنی روشن و بینا دیکھتی و بھالتی آنکھوں کو کیسے اندھا بنائے۔

آپ ہی میں سے کچھ حضرات ایسے بھی ہیں جن کا آغاز بڑا شاندار اور امید افزا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے بڑھاپے سے بہت قبل عین عالم شباب میں یہ حضرات پنشن پر چلے گئے یا جوان ہونے سے قبل ہی بوڑھے ہو گئے۔ مولوی ضیاء الحسن علوی، مولوی جواد علی خاں عالی، مولوی ظہور احمد وحشی، خواجہ عبدالواحد، مولوی عبدالباری وغیرہم اسی فہرست میں آتے ہیں۔ مایوس نہ ہوجیے کیا عجب ہے کہ سوکھے دھانوں اب بھی پانی پڑ جائے اور دین کی غیرت ان کے دلوں کی جنبش کو ان کے قلم کی جنبش میں تبدیل کر دے ان میں بعض اپنے اپنے رنگ میں اب بھی اسلام نہ سہی اہل اسلام کی خدمت کر رہے ہیں، لیکن وقت کی ضرورتوں کا تقاضا کہیں زیادہ شدید ہے، معرکہ سخت، حالات نازک اور فضا ناسازگار۔ ضرورت ہے کہ دین کے لشکر کا ایک ایک سپاہی بوڑھا ہو یا جوان، آزمودہ کار ہو یا نومشق، پہلوان یا ناتواں اپنے زاویے سے نکل کر بے تحاشا اور دیوانہ وار میدان کی طرف لپکے

نیست رخنہ گرچہ در عالم پدید
ہم چو یوسف خیرہ سر باید دوید

یوسف علیہ السلام بس بے تحاشہ مقفل دروازوں کی طرف دوڑ پڑے اور قفل خود بخود کھلنے شروع ہو گئے۔ اگر محض عقل مصلحت اندیش پر اعتماد کر کے یہ سوچتے ہی رہتے کہ بیکار دوڑنے سے کیا حاصل تو قفل قیامت تک نہ ٹوٹتے۔

نظر کو اور وسعت دیجئے، آپ ہی کی برادری کا ایک رکن جس نے وطن سے ہزاروں میل دور جا کر "نئی دنیا" میں پہونچ کر پُرانے دین کا پیغام ہزار ہا ہزار کانوں تک پہونچایا، ہزاروں دلوں میں اُتارا اور صدہا زبانوں سے اس پر ایمان لانے کا اقرار کرایا۔ کیا یہ سعادت بجز آپ کی جماعت کے، اہل سنت کے کسی اور گروہ کے نصیب میں آئی؟ مرحومین کو یاد کیجئے، تو وہ معصومیت کا پتلا عبدالرحمان نگرامی اخلاص میں ایثار میں، وردمندی میں دینداری میں، سادگی میں تقویٰ میں کسی میں پیچھے تھا؟ اسے آپ کسی کے سامنے لانے میں جھجکتے اور شرماتے کیوں رہے ہیں؟

دین کی خدمت کا حصر محض تصنیف و تالیف، خصوصاً کلامی رنگ کے اندر نہیں، گو مقاصد ندوہ اس مستقل اور اہم شعبۂ دین تک محدود ہیں، آپ کے دارالعلوم کا طرۂ افتخار یہ ہے کہ اس کے فاضلوں اور فارغوں نے حدود علم سے نکل کر دائرہ عمل میں بھی اپنے جوہر دکھائے اور یہاں بھی ان کے جوہر کسی کے مقابلے میں ماند نہ پڑنے پائے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں جب تحریک خلافت نے مردہ دلوں کو بھی زندہ کر دیا اور سنہ ۱۹۲۶ء میں جب مسئلہ حجاز نے ایک عالمگیر فتنہ کی صورت اختیار کر لی ان دونوں ہی موقعوں پر آپ ہی کا ہم وطن، ہم مسلک و مشرب ایک بار بحیثیت رکن وفد اور دوسری بار بحیثیت رئیس وفد ہندوستان کے مجاہد اعظم محمد علیؒ کا رفیق و ہمدوش تھا۔ پھر اس تحریک خلافت کے زمانہ میں سالہا سال تک جس نے نہ صرف اپنے ضلع میں کانگرس اور خلافت کا کام انتہائی نظم و خوش اسلوبی سے چلایا بلکہ سارے صوبہ سارے ملک کے لئے ایک نمونہ قائم کر دیا اور سرداران ملت، علی برادران کی زبان سے بار بار سند امتیاز حاصل کی، وہ یہی حضرت ہیں جن کا نام آپ نے بالکل بجا طور پر آج اپنے جلسہ کی صدارت کے لئے لیا ہے۔

اور آگے چلئے جس سنجیدگی اور ہوشمندی کے ساتھ آپ کے ایک بھائی مولوی اکرام اللہ خاں علی گڑھ سے کانفرنس گزٹ نکال رہے ہیں، جس انہماک اخلاص و تندہی کے ساتھ مولوی شبلی متکلم، سرائے میر میں مدرسہ چلا رہے ہیں اور جس خوبی و خوش اسلوبی کے ساتھ آپ کے ایک نوعمر و نوآموز بھائی سید رئیس احمد جعفری نے پیشوائے ملت محمد علی کی سیرت تیار کر دی۔ یہ ساری چیزیں آپ کے فخر اور آپ کی مسرت کی ہیں۔ فخر اور مسرت کی چیزوں پر مغرور و متکبر ہو جانا شیطان کا کام ہے اور ان کا سجدۂ شکر بجا لانا اور ان کا تذکرہ بطور تحدیث نعمت کرنا مسلمان کا شیوہ ہے، خوش ہو جیے اور شکر کیجئے اور شکر کر کے مزید نعمتوں پر اپنا حق جمائیے۔ لوگ کہتے ہیں کہ انگریزی پڑھ کر عقائد میں تزلزل کسی درجہ میں تو بہرحال آجاتا ہے اور باطن نہ سہی جب بھی کم از کم ظاہر تو سلامت رہنے نہیں پاتا اس خیال کی واضح عملی تردید اگر مقصود اور اس باب میں پورا شرح صدر اگر مطلوب ہو تو کوئی آکر یہاں اس مولوی صورت اور صوفی سیرت کی زیارت کرے جس نے چار سال تک انگریزی کالج میں تعلیم پاکر بی، ایس، سی کی ڈگری لی، سائنس کے بعض مضامین میں، ساری یونیورسٹی میں امتیاز حاصل کیا اور پھر مسلسل پانچ سال تک یا جوجی فضا کے درمیان سائنس لے کر ایم، بی، بی، ایس کی سند حاصل کی اور آج اتنے بڑے ادارے کی ذمہ داری اپنے سر لئے ہوئے ہے۔

افراد کے نام اور کام ایک ایک کوئی کہاں تک گنتا اور کہاں تک کوئی سنتا رہے، بحمد اللہ آپ ہی کے قائم کئے ہوئے اس دینی ماحول اور فضا کا یہ اثر ہے کہ آج یا جوجیوں کی زد جہاں بھی اور جب بھی دین پر پڑتی ہے۔ آپ کا ندوہ ہی جو تڑپ جاتا ہے اور اسکے ارکان، اساتذہ، طلبہ، سب کے سب کانہم بنیان مرصوص اس کے مقابلہ میں پہلی ہی آواز پر السابقون الاولون سے سرفراز بغیر دوسروں کا انتظار کئے مردانہ نکل آتے ہیں اور بہادرانہ ڈٹ جاتے ہیں۔ رنگون کے ایک گندہ ذہن کا خبیثانہ مضمون جب منظر عام پر آیا تو سب سے پہلے صدائے احتجاج آپ کے ندوہ ہی سے اٹھی اور رنگون کو چھوڑیے آپ ہی کے شہر میں ابھی پچھلے سال جب ایک فتنہ فروش نے سر بازار گند کی اگلنی شروع کی تو زبان و قلم دونوں سے اس کی سرکوبی کے لئے مجاہدین شہر کا جو لشکر آگے بڑھا اس کا مقدمۃ الجیش آپ کا ندوہ ہی تھا۔ ندوہ کے ناظم بھی ارکان بھی، اساتذہ بھی طلبہ بھی! اس فتنہ گر کی جھولی میں نوجوانوں کے لبھانے کے توصد ہا منتر بھرے ہوئے تھے۔ پھر اگر آپ کے نوجوان بھی اس کے افسوں سے محفوظ رہے بلکہ الٹے اسی پر حملہ آور ہو گئے تو اسے بجز حق تعالیٰ کے لطف و کرم اور آپ حضرات کی حمیت دینی کے اعلیٰ نمونوں کے اور کس شے پر حمل کیجئے!

برادران کرام، قصہ طویل ہوا جاتا اور سننے والے اکتا گئے۔ آپ جو کچھ کر چکے وہ ماشاء اللہ کافی ہی نہیں وافی ہے اور دوسروں کے لئے موجب رشک۔ سارے کارناموں کی شرح کا نہ موقع نہ محل نہ وقت میں اتنی وسعت نہ زبان میں اتنی قوت۔ لیکن آپ کو آئندہ جو کچھ کرنا ہے وہ بھی کچھ کم نہیں تفصیل اگر شروع کی جائے تو خطبہ اپنے حدود سے گذر کر ایک ضخیم دفتر بن جائے۔ مختصراً صرف دو باتیں عرض کر کے صدر محترم کے لئے جگہ خالی کرتا ہوں۔

پہلی عرض یہ ہے کہ ندوہ آپ کا ہے آپ بھی اُسے اپنا سمجھیں، محض زبان سے نہیں، زبان عمل سے۔ مالی مشکلات میں تو اس وقت سارے ادارے مبتلا ہیں، اور بعض بڑے قدیم ادارے تو گویا سسک ہی رہے ہیں۔ ندوہ اس عالمگیر ابتلا سے مستثنیٰ نہیں۔ اس کی اعانت و امداد آپ کے اہم فرائض میں سے ہے۔ نکتہ چینی سے زیادہ سہل دنیا میں کوئی کام نہیں، آج جو چاہے بغیر اپنی ذمہ داری محسوس کئے موجودہ عہدہ داروں اور کارکنوں پر الزامات لگا ڈالے۔ کاش بجائے اس کے ہم میں سے ہر شخص صرف اپنے سے یہ سوال کرے کہ میں نے اب تک ندوہ کی عملی امداد کیا کی ہے، اور آمدنی کا کتنا حصہ اس کی نذر کیا ہے۔ اپنے خوش حال دوستوں سے کہاں تک امداد دلائی ہے؟ اپنے وقت عزیز کے کئی گھنٹے ندوہ کے کام کے لئے نکالے ہیں۔ ہاں ادارہ خصوصاً اصلاحی ادارہ کے چلانے میں جو عملی دشواریاں رونما ہوتی ہیں انھیں کچھ کارکنوں ہی کا دل و جگر جانتا ہے۔ ہم اُن ذمہ داریوں کو دوسرے کے سر ڈالے ہوئے ہیں تو کم از کم انھیں کچھ امداد تو دے ہی دیا کریں۔

دوسری اور آخری بات عرض کرنے کی یہ ہے کہ آپ سب فرزندانِ ندوہ ہیں لیکن ندوہ کسی عمارت کے در و دیوار، اینٹ اور چونے کے انبار کا نام نہیں۔ ندوہ نام ہے چند مقاصد کا۔ اور ان مقاصد کا خلاصہ صرف ایک دینی خدمت، دین کا درد، دین کی حمایت و نصرت، و دو اعدائے دین سے مقابلہ، تصنیف و تالیف، تدریس، صحافت، ملازمت کوئی سا بھی پیشہ آپ انتخاب اور کون سا شعبۂ زندگی آپ اختیار کریں۔ ہر حال میں آپ سب سے پہلے مسلمان ہیں اور اسلام کی غیرت رکھنے والے مسلمان، دین کی حرمت سے بپھر جانے والے شیر، آپس میں حلم و رواداری رکھنے والے ایک دوسرے کی لغزشوں خطاؤں سے درگذر کرنے والے اخوت و محبت کی تصویر رحماء بینھم کی تفسیر، لیکن جس وقت کوئی (حاکم بدہن)

اللہ کے پیام اور پیامبر سے تمسخر کی جرأت کرے گا تو معاً آپ جوش غیرت کے پتلے بن جائیں گے۔ ان مجرموں کے حق میں برہنہ شمشیر اشداء علی الکفار کی تعبیر! اس غیرت قومی کا ایک نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کے جو برادران عزیز ابھی یہاں زیر درس ہیں، خود آپ ہی کے نقش قدم پر چل کر اس باب میں آپ سے مسابقت کرنے لگیں گے۔ تقاضائے سن سے ان میں بعض عملی کمزوریاں پیدا ہو جانا اور فضائی تاریکیوں سے کس حد تک متاثر ہو جانا بالکل قدرتی ہے۔ آپ کی قائم کی ہوئی نظیر ڈوبتے ہوؤں کو نکالے گی اور جو لڑکھڑا رہے ہیں انھیں سنبھالے گی۔

اے کریم و کارساز! ہم سب کو ہمارے دوستوں اور بھائیوں کو، ہمارے رفیقوں اور شریکوں کو، ہمارے بڑوں کو اور چھوٹوں کو، اپنی مرضیات کی راہ پر چلا! جب تک جئیں تیرا نام جپتے رہیں، جب وہ وقت آئے جو سب کو پیش آتا ہے تو تیرے ہی نام کا کلمہ پڑھتے ہوئے رخصت ہوں جب وہ گھڑی آئے، سارے سہارے بودے اور سارے آسرے بے وفا نکلیں تو تیرا ہی سہارا کافی ثابت ہو اور تیرا ہی آسرا ہر مشکل کو آسان بنائے، جب آنکھیں آخری بار بند ہونے لگیں تو کسی بن دیکھے کا جمال ان میں بسا ہو۔ جب رگیں کھنچنے لگیں، دم سینہ میں گھٹنے لگے اور آنکھوں کی پتلیاں چڑھنے لگیں تو لب پر تیرا نام اور دل میں تیری ہی یاد! اور جب حشر میں اٹھیں تو اے سب کی سننے والے مولیٰ تیرے اور تیرے محمد کے باغیوں میں نہ ہوں! محشور ہوں تو تیرے دین کے ان سپاہیوں میں ہوں جنھوں نے آخر وقت تک اپنی جگہ نہ چھوڑی ساتھیوں اور رفیقوں کو برابر گرتے اور کٹتے اور ٹوٹ ٹوٹ کر دشمنوں سے ملتے دیکھا پر خود ہمت نہ ہارنا اور تیرا جھنڈا اپنے نحیف و ناتواں ہاتھوں میں لئے ہوئے آخری سانس تک اسے گرنے نہ دیا حالانکہ خود گر گئے؟

وآخر دعوانا

أن الحمد

للہ رب العٰلمین۔

ایک نام کے ندوی کا دوسرا پیام ——— ندوہ برادری کے نام

(خطبۂ صدارت جلسہ انجمن قدیم طلبۂ ندوہ ۲۱ دسمبر ۴۰ء)

(۱)

آٹھ سال بعد یادوں کی طبیعت پھر لہرائی اور اب کی زندہ دلوں نے اس سے بھی بڑھ کر دل لگی کی ٹھہرائی جو ندوی محض نام کا، اور جس کی ندویت نری اعزازی اللہ اللہ! اس کے نصیب میں یہ سرفرازی ۳۲ء میں تو پھر غنیمت تھا کہ صدارت محض استقبالیہ کی رہی ۴۰ء میں آ کر اسی کی صدارت اصل جلسہ کی! ——— ایک ناچیز کو اپنی ستم ظریفی کا ہدف بناتے اللہ کے نیک بندوں نے اتنا نہ سوچا کر باہر کی دنیا ان کے اس "حسن انتخاب" پر کھلکھلا کر ہنس نہ پڑے تو آخر کیا کرے؟

بزرگو اور عزیزو، بڑے اور چھوٹے بھائیو! آج آپ مدتوں بعد پھر وہ اکٹھے ہوئے ہیں جہاں آپ کی عمر کے بہترین اور خوشگوار حصے گذر چکے ہیں کسی نے صرف چند مہینے اور کسی کے سالہا سال کوئی بچپن میں آیا ہوگا، اور جوان ہو کر نکلا ہوگا کوئی مبتدی کی حیثیت سے داخل ہوا ہوگا اور عالم و فاضل ہو کر رخصت ہوا ہوگا۔ آج بے اختیار یاد آ رہے ہوں گے وہ پرانے ہم نشین اور ان کی صحبتیں وہ زمانۂ معصومیت کے شوق اور جوانی کی ہمتیں! وہ بے فکری کی ہنسی اور چہچہے، وہ نوعمری کے عزم و ولولے وہ طالب علمی کی راتیں اور ان میں بیداریاں، وہ آپس کی نوک جھونک اور پھر ہمدردیاں اور غمگساریاں! وہ یہاں کے صحن

اور میدان کے کھیل کود، وہ یہاں کی مسجدوں کے رکوع اور سجود! وہ امتحان کی کامیابیاں اور کبھی ناکامیاں وہ استادوں کی شفقتیں اور کبھی جھڑکیاں! دنیا کے جھمیلوں میں پڑ کر، عملی زندگی میں قدم رکھ کر فکر معاش کی دلدل میں پھنس کر، اب قدر ہو رہی ہوگی یہاں کی آزادیوں کی، بے فکریوں کی، خوش وقتیوں کی؟ آہ! کیسی مٹھاس تھی اس وقت کی تلخیوں میں اور کتنی لذت تھی اس سن کی بدمزگیوں میں! ——— کاش وہ زمانہ پھر آتا! کاش بس میں ہوتا پھیر لانا گئے ہوئے سن کا گزرے ہوئے دن کا! کاش ممکن ہوتا زمانہ کی گھڑی کی سوئی کو الٹا گھما دینا!

یہ حسرتیں تو اب زندگی کے ساتھ ہیں لیکن برادران کرام! ماضی کیسا ہی خوشگوار، اس کی یاد کیسی ہی پرلطف سہی، فکر کی چیز تو ماضی نہیں حال و مستقبل ہے، اور اصل دولت خود شناسی کی دولت ہے۔

روزہا گر رفت گو رو باک نیست؟
تو بماں اے آنکہ جز تو پاک نیست!

نہ ہو کہ جب یہ حال بھی ماضی بن جائے اور "آئندہ" "گزشتہ" میں تبدیل ہو جائے تو ہم آنسو بہائیں اس وقت کی فرصتوں پر، اور سینہ کوبی کریں آج کی مہلتوں پر! ساری خرابیاں تو پیدا ہوتی ہیں اپنے کو بھلا دینے سے، اپنے کو پہچان لیجئے، اپنے مقام کو جان لیجئے، عرفان نفس کا سبق حاصل کر لیجئے تو ابھی ساری مشکلیں حل ہوئی جاتی ہیں۔

ندوہ یا دار العلوم ندوہ نام در و دیوار کا نہیں اینٹ و چونے کی عمارت کا نہیں، دفتر نظامت کے کاغذات اور رجسٹروں کا نہیں، کتب خانہ یا اقامت خانہ کا نہیں، نام ہے چند مقاصد کا، ایک متعین پروگرام کا، ایک بلند نصب العین کا۔ اگر آپ ندوی ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے ندوہ کے اس پیام کو قبول کر لیا۔ اس آواز کے آگے اپنا سر جھکا دیا، ندویت کوئی مادی ڈپلوما یا کاغذی سند نہیں، نام ہے اس نسبت کا، اس رشتہ کا، اس رابطہ قلب کا، جو آپ نے مقاصد ندوہ کے ساتھ قائم کر لیا۔ ندوی ہوتے آپ کے جزو زندگی بن گئے یہ مقاصد ندوہ اور یہ فرض ہو گیا آپ پر ان مقاصد کے اعتقاد و عمل کا، ان کی تبلیغ و ترویج ان کی نشر و اشاعت اب آپ ان لوگوں سے ملیں گے، ان کے لئے لڑیں گے ان کے لئے کھنچیں گے ان کے لئے جھکیں گے ان کے لئے تنیں گے غرض یہ کہ جئیں گے ان کے لئے!

مقاصد کی فہرست کچھ بہت طویل نہیں، پھیلانے کی جگہ سمٹنے پر اور بسط کی بجائے ایجاز پر آئیے تو کل دو لفظوں میں ادا کر سکتے ہیں اسلام کی خدمت اور دین کی نصرت! توحید کی حرارت اور ناموس رسول کی غیرت! اسی کی شان سے جینا اسی کی آن پر مرنا "فلا تموتن الا وانتم مسلمون" یہی مقصد ہے اور یہی مدعا یہی قبلہ مقصود اور یہی نظر کا منتہا۔ باقی جو کچھ ہے اسی متن کی شرح اور پھر شرح کا حاشیہ درس و تدریس کے مشغلے، عبادتوں کے سلسلے، تصنیف و تالیف کی الماریاں وعظ و تذکیر کی سرگرمیاں سب اسی مقصود کے ماتحت اور اسی کے تابع سب اسی مطلوب کے وسائل اور ذرائع۔

دین کی نفس خدمت میں یہ نہیں کہ ندوہ منفرد ہو دین کی خدمت ندوہ کے وجود میں آنے سے پہلے بھی ہو رہی تھی، اب بھی ندوہ کے حدود سے باہر ہو رہی ہے دہلی، لکھنؤ، دیوبند، سہارنپور وغیرہ وغیرہ کی درسگاہیں پہلے بھی معطل نہ تھیں، اب بھی خاموش نہیں ہیں، کہیں تجوید سکھائی جا رہی ہے کہیں رجال پر جرح و تعدیل ہو رہی ہے کہیں صرف فقہ کے مفتی نکل رہے ہیں اور کہیں دیہات کے لئے مبلغ و مناظر ڈھل رہے ہیں یہ سب خدمتیں اپنی اپنی جگہ پر اہم ہیں اور مستحق اجر بھی قابل قدر بھی۔ لیکن ندوہ کا دائرہ عمل ان سب سے کچھ الگ سا ہے اس کا مقابلہ ہے وقت کے سب سے پر قوت اور سب سے پر شوکت فتنہ سے، ڈنک مار کر تڑپا دینے والے بچھوؤں سے نہیں بلکہ مسلم نگل جانے والے اژدہے سے! اس کا ہتھیلیوں میں گڑی ہوئی پھانسیں تلووں میں چبھے ہوئے کانٹے نکالنا نہیں اس کا کام ہے جسم ملت کو محفوظ رکھنا۔ سر کے صدمہ سے، قلب کے اوپر حملہ سے۔ فتنہ کا نام دجالیت رکھئے یا فرنگیت بہرحال ہے وہ فتنہ قیامت! ترکی اس کا شہید، ایران اس کا قتیل، مصر اس کا شکار، ہندوستان میں اس کے پھیلنے کے راستے بے شمار کہیں وہ آ رہا ہے۔ یونیورسٹیوں، کالجوں، اسکولوں کی راہ سے کہیں قدم جما رہا ہے۔ مختلف کانگریسوں، کانفرنسوں کے بھیس میں، اخبارات اور رسالے اس کے نقیب، سینما اور ریڈیو اس کے وکیل، کہیں وطن پرستی کا نقاب اس کے چہرے پر پڑا ہوا کہیں وہ تجدد کے پردے میں جلوہ نما کہیں لاطینی حروف کا پروپیگنڈہ، کہیں شور نسائیت اور بے پردگی کا چرچا، غرض خدا معلوم کتنے اس کے نام ہیں اور کتنے مظاہر۔ پیچ ندوی کی زبان جب کھلے گی اسی حملہ کے جواب میں اس کا قلم جب اٹھے گا اسی حریف کی تردید میں مقابلہ جب ہوگا اسی عدو مبین سے، اسی الدّ الخصام سے!

ندوہ کی تاریخ دیکھ جائیے قدیم ترین ناظم مولانا شاہ محمد علی مونگیریؒ تھے مسیحیت کی تردید میں دفتر کے دفتر اس وقت لکھ ڈالے جب دل و دماغ مرعوب تھے ——— دانایان فرنگ کی دانائی اور حکمت سے اور باستثناء شاذ کسی میں نہ ہمت تھی اور نہ حوصلہ فرنگیت اور فرنگیوں کے مقابلہ میں آنے کا، آفریں آپ کے اس قدیم ترین ندوی کے اس عزم مجاہدانہ پر، اس ہمت مردانہ پر!

شبلی مرحوم کے دور میں آئیے ان کا تو اوڑھنا، بچھونا ہی تھا اس حریف سے زور آزمائی کرنا۔ سوال یہاں شبلی کے جوابات کی قوت وضعف کا نہیں صرف ان کے سطح نظر کا ہے تاریخ ہو سوانح عمری ہو، ادب ہو اور تواد و شاعری ہو کوشش ہر جگہ یہی رہتی ہے کہ اسلام کا بول بالا ہو اور دین کا چہرہ روشن سے روشن تر نظر آئے کہیں اورنگ زیب سے بدگویوں کا طعنہ دور کر رہے ہیں کہیں مامون الرشید کا دربار سجا رہے ہیں کہیں فاروق اعظمؓ کی آستانہ بوسی کی تیاریاں ہیں، کہیں غزالی، نعمان ابی حنیفہ اور مولانا روم کی سوانح حیات شمار ہے ہیں کلامی رنگ سب میں جھلکتا ہوا، حد یہ کہ جب فارسی شاعری اور شاعروں کے خالص تذکرہ شعر العجم پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس کی تعریف میں یوں زمزمہ سنج ہوتے ہیں۔

"اسلام ایک ابر کرم تھا اور سطح خاک کے چپہ چپہ پر برسا لیکن فیض بقدر استعداد پہونچا۔ جس میں جس قسم کی قابلیت تھی اسلام نے اس کو اور چمکایا ترک شجاع تھے شجاع تر ہو گئے۔ ایرانی ہمیشہ سے تہذیب معاشرت اور علوم و فنون میں ممتاز تھے اسلام نے ان کو ممتاز تر کر دیا۔"

اور آخری تصنیف سیرت النبیؐ جس کے تمام ہونے سے بھی قبل خود مصنف کا تمت بالخیر ہو گیا اور اس کی کلامی حیثیت اس کی تاریخی حیثیت سے زیادہ نمایاں ہے۔

مولانا شبلی ہی کی لپیٹ میں ان کے عزیز قریب مولانا حمید الدین فراہی اور ان کے رفیق و حبیب مولانا شروانی کو لے چلئے۔ فراہی مرحوم و مغفور تو زندگی بھر ہی قرآن مجید میں لگے لپٹے رہے لیکن خود شروانی صاحب کے دینی کارنامے اور اسلامی خدمات کب محتاج ہیں کسی تعارف جدید اور توضیح مزید کے! ان دونوں کے گہرے تعلقات ندوہ اور اہل ندوہ سے بالکل ظاہر و واضح ہیں پھر تلامذہ شبلی ہی کی فہرست نظر میں رکھئے تو خدا معلوم کتنے بڑے بھی اعزازی ندوی، قلم کے دھنی اور مخالفین اسلام کے حق میں دلیر اور جری نکل آئیں گے معارج الدین صحیفہ سماوی وغیرہ کے مصنف سید نواب علی ایم۔ اے اور کامریڈ کے مشہور حق گو ایڈیٹر مولانا محمد علی جوہر یہ دو نام اس سلسلہ میں کافی ہوں گے۔ دونوں کی حمایت ندوہ، اور دونوں کی دلچسپیاں ہماری جماعت کے ساتھ محتاج بیان نہیں۔

یاد اب پڑا ترتیب ذاتی کے لحاظ سے ایک نام مولانا شبلی سے بھی پہلے آنا چاہئے تھا صوبۂ بہار میں ایک مشہور و پرانا قصبہ ہے پھلواری پڑھے لکھوں میں کون ناواقف ہے اس کے بلبل ہزار داستان مولانا شاہ محمد سلیمان سے؟ کانفرنس کے مجمع میں ندوہ کے جلسہ میں جہاں کہیں یہ واعظ سحر بیان کھڑا ہو گیا۔ سننے والوں کا ٹھٹ لگ گیا۔ ہجوم بوڑھوں کا جوانوں کا، عربی والوں سے کچھ ہی بڑھ کر انگریزی والوں کا اب حضرت سلیمان ہیں کہ خدا جانے کتنے پڑھے جنوں کو شیشہ میں بند کرتے جاتے ہیں، کتنے عفریتوں کو جان سے مارتے جاتے ہیں اپنے میٹھے بولوں سے مثنوی کے سُریلے نغموں سے بگڑے ہوؤں کے ایمان سنوارتے جاتے ہیں۔ فرنگیت اور لادینی کے داغ دھبے دلوں سے دھلتے جاتے ہیں۔ شاہ صاحب مرحوم و مغفور آپ ہی کے ندوہ کے رکن خاص الخاص تھے۔

آپ کے قدیم ارکان میں کاکوری کے منشی اطہر علی مرحوم نے جس ہمت اور پامردی سے صوبہ کی طاغوتی حکومت کا مقابلہ کیا اس کی نظیر اس وقت کی تاریخ میں ملنی آسان نہیں۔ بعد کے ارکان میں ایک نام نامی شیخ مشیر حسین قدوائی مرحوم کا ہے انگریزی میں رسالوں، پمفلٹوں، کتابچوں کا ایک انبار لگا گئے ہیں سب کے سب مسائل اسلامی ہی کی حمایت و نصرت میں اور آخر میں تو بالشویزم اور اسلام پر ایک ضخیم و معرکۃ الآرا کتاب لکھ کر اپنی ندویت کا حق ادا کر گئے۔ پھر آپ کے ایک سابق شیخ مولانا امیر علی مرحوم و مغفور کی خدمات دینی کوئی بھلانا چاہے تو کیونکر بھلا سکتا ہے؟ ہدایہ اور عالمگیری جیسی ضخیم کتابوں کا نہ کمل ترجمہ بلکہ شرح بھی اور فتح الباری کے ضخیم مجلدات کے بیشتر حصوں کو اردو میں منتقل کر جانا اور پھر ۱۰ جلدوں کی طویل و عریض و ضخیم تفسیر مواہب الرحمان اور اس کے مقدمہ میں جدید مسخ شدہ ذہنیت سے تخاطب یہ کارنامے ایسے ہیں کہ بجائے ایک فرد کے اگر ایک جماعت پر تقسیم کر دیے جائیں تو جماعت بھر کے فخر کے لئے کافی ہیں۔

(۲)

محترم بزرگوں اور استادوں سے قطع نظر اب براہ راست

اپنی جماعت کی طرف آئیے طلبائے قدیم یا اولڈ بوائز یا اس کا لفظی ترجمہ پسند ہو تو "بوڑھے لڑکے" اور یہاں میر محفل اپنے جانے پہچانے سید الطائفہ سیدؔ ان کو پائیے وقت کے ہر فتنہ کا مقابلہ آج اُن سے بڑھ کر کس نے کیا ہے؟ ملت کی ہر ضرورت پر ان سے بڑھ کر اور کون کام آیا ہے! سیرت سرورِ کائنات پر اپنے مخصوص کلامی رنگ میں دفتر کے دفتر انہوں نے تیار کر ڈالے فتنۂ انکار حدیث کے مقابلہ میں ان کا قلم آج تک شمشیر قاطع۔ اسلام کا پیام ہزار ہا ہزار نوجوانوں کے دل و دماغ تک انہوں نے پہونچایا۔ شکوک و شبہات کے دلدلوں سے خدا معلوم کتنے انگریزی خوانوں کو نکالا۔ خود آپ کے اس شہر میں معقولیات کا معروف و معلوم فسوں گر ہے اس کے منتروں کا توڑ سب سے بڑھ کر کیا۔ پھر ان کے ساتھ ان کے رفیقوں اور شاگردوں کی جو سرگرم اور کارکن ایک پوری جماعت موجود ہے قابل فخر بھی ہے قابل قدر بھی۔ وہ بھی آخر سب ندوی ہی کی ہے یا کسی اور کی؟ دار المصنفین کے کارنامے ہندوستان ہی سے نہیں بیرون ہند سے بھی داد حاصل کر چکے ہیں لیکن خود یہ ادارہ ندویوں کا ساختہ پرداختہ اور ندوہ ہی کا ایک پرتو نہیں تو اور کیا ہے! اور وہاں کے مشہور و معروف منیجر جن کے ورود مسعود سے ہم اس وقت بھی سرفراز ہو رہے ہیں بحیثیت "قوال" جیسے بھی کچھ ہوں ان کے فعال ہونے اور ملی معاملات میں انکی زبردست فعلیت سے کسی منکر کو بھی انکار ہے؟

اعظم گڑھ ہی کے گوشہ میں ایک چھوٹے سے قصبہ میں خدمت قرآن کا جو کام انجام پا چکا ہے یا اب انجام پا رہا ہے اور وہاں کی زندگی کی قابل رشک صفائی اور سادگی سب آپکے ندوہ ہی کا فیض ہے اور اس کے پڑوس کا قصبہ نگرام کس طرح آپ کے ندوہ کی علمی نورانیت سے جگمگا رہا ہے حیدرآباد کی اہم علمی و دینی زندگی میں ندوہ کا جو اہم ہاتھ ہے وہ کس سے پوشیدہ ہے؟ جواں مرگ عبدالرحمٰن نگرامی جیسے جواں صالح جامع علم و عمل فرزند کیا ہر مدرسے کے نصیب میں ہر روز آتے رہتے ہیں۔ دکن، بمبئی، دہلی، پنجاب، بہار، یوپی، بنگال ہندوستان کی مختلف علاقوں کی تعلیمی و تدریسی زندگیوں میں آپ کے دار العلوم کا عنصر کہاں موثر نہیں؛ صحافت جہاں کہیں بھی ندوہ کے ہاتھ میں ہے خصوصاً علی گڑھ اور بمبئی میں اپنی متانت و شرافت کا امتیاز قائم کئے ہوئے ہے۔ جامعہ ازہر جیسی دنیائے اسلام کی ممتاز ترین درسگاہ پر جو گہرا اور عظیم الشان نقش آپ کے ایک بھائی ابھی حال میں چھوڑ گئے ہیں۔ وہ ہمارے فخر کے لئے بہت ہے۔ دین کی تڑپ، تبلیغ دین کی دھن کی مجسم مثال دیکھنی ہو تو انہیں اللہ نظر بد سے محفوظ رکھے اور ان کی اخلاقی صلاحیتوں کو پختہ تر کرے اسی مجمع میں علی میاں کو دیکھ لیجئے خود دار العلوم اور مجلس ندوہ کو کہنا چاہئے کہ اس وقت ملک میں عرصہ سے آپ ہی کی برادری کے لوگ چلا رہے ہیں۔ ناظم ندوہ ندوی، معتمد تعلیم ندوی، مہتمم دار العلوم ندوی وقس علی ہذا۔ پھر مدرس کی جگہ مدرس، تاجر کی جگہ تاجر، طبیب کی جگہ طبیب، ایڈیٹر کی جگہ اڈیٹر غرض اجتماعی زندگی کا کون سا شعبہ ہے جہاں آپ کے بھائی بندوں کو ایک نمایاں اور امتیازی حیثیت حاصل نہیں اور ندویت ان سب میں مشترک۔ بہت سے

ایسے بھی ہیں جنھیں براہ راست اسلام کی خدمت کے موقع حاصل ہیں یا اپنے مختلف عہدوں اور منصبوں سے اہل اسلام ہی کے خادموں کی فوج میں داخل ہیں مقصود ان مثالوں کے پیش کرنے سے ان ناموں کے یاد دلانے سے اپنی جماعت کی بڑائی جتلانا نہیں اپنوں کو چکانا نہیں تحدیث نعمت منعم کے ادائے شکر کے ساتھ اپنے کو ان فرائض کی طرف اور زیادہ متوجہ کرنا ہے۔ کوئی کہاں تک گنتا رہے، کوئی کہاں تک سنتا رہے ؛ ایک ایک نام کو ایک ایک کام کو بحمد اللہ آپ ہی کے قائم کئے ہوئے دینی ماحول کی برکت اور تبلیغی فضا کی برکت ہے کہ یاجوجوں اور دجالیوں کی زد آج جہاں بھی اور جب بھی دین پر پڑتی ہے، یہ آپ کا ندوہ ہی ہے کہ سب سے پہلے تڑپ اٹھتا ہے اور پہلی ہی آواز پر آپ کے ارکان، اساتذہ، طلباء سب کے سب دوسروں کا انتظار کئے بغیر جوانمردانہ باہر نکل آتے ہیں اور بہادرانہ ڈٹ جاتے ہیں اس کا حال کوئی اس فتنہ فروش کے دل سے پوچھے جس کی مرتدانہ فتنہ نگاریاں اب رسوائے عالم ہو چکی ہیں اس کے ہر حربہ کو کند کرنے والی جماعت سب سے بڑھ کر آپ ہی کے ندوہ کے فرزندان قدیم و جدید کی نکلی۔ ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء اپنے چھوٹے بھائیوں یعنی موجودہ طلبہ کی مشکلوں کا اندازہ کیجئے ان کی کڑی آزمائشوں کو نظر میں رکھئے شہری زندگی کے عام فتنے اور بلائیں جو ہر بڑے مرکز کی طرح اس شہر پر بھی مسلط ہیں۔ انھیں چھوڑ ئیے صرف یہ سوچئے کہ یہ کس سنہ میں کہاں رہ رہے ہیں؟ ان کے عین پڑوس میں کون سی عمارتیں عظیم الشان اور لق و دق ہیں؟ یہاں کے دن گزرتے رہتے ہیں۔ اسٹرائکوں، مطالبوں، مظاہروں کے نعروں میں راتیں بسر ہوتی رہتی ہیں۔ سینما اور گراموفون اور ریڈیو کے نغموں میں آپ کے عزیز اگر اس فضا، اس ماحول میں بھی اپنا تقویٰ اپنی شرافت قائم رکھے ہوئے سکون یکسوئی کے ساتھ اپنی تعلیم و تدریس میں مشغول ہیں تو اسے اللہ کی رحمت کے بعد اور کس پر محمول کیا جائے۔

خطبہ "اولڈ بوائز" کے جلسہ کے حدود سے بڑھ چلا سامعہ نوازی کی جگہ سامعہ خراشی ہو چکی اور عجب نہیں کہ سامعین کی جبین تحمل پر بل پڑنے لگیں ساری گفتگو چلی تھی اس پر کہ خود شناسی پیدا کیجئے اپنے کو پہچانئے اپنی اس خودی کو قائم رکھئے اپنی اس روشنی کو مدھم نہ ہونے دیجئے اور وہ خودی کیا ہے؟ فلسفہ خودی کے مشہور اسرار شناس اقبال کے الفاظ میں سے

خویش را دریاب از ترک فرنگ

ندوی کی خودی ندویت بس اسی ترک فرنگ کا دوسرا نام ہے۔

درگزر از جلوہ ہائے رنگ رنگ
خویش را دریاب از ترک فرنگ

ماضی و حال کا سرسری جائزہ ہو چکا اب مستقبل کے لئے مختصر سا پیغام سُن لیجئے اور یہی مقطع کا بند ہے۔
سب سے پہلی عرض یہ ہے کہ ندوہ آپ کا ہے آپ بھی ندوہ کے ہو جائیے اسے اپنا سمجھئے اسے اپنی زندگی کا ایک جزو بنا لیجئے کارکنوں پر نکتہ چینی سے

بڑھ کر آسان اور نفس کو خوش کرنے والا اور کوئی مشغلہ نہیں کیا اچھا ہوتا کہ ہم بجائے اس کے خود اپنی ذمہ داریوں کی فکر میں لگ جاتے اپنے وقت عزیز کا کتنا حصہ ندوہ کے کاموں کے لئے نکالا! اپنی آمدنی میں اپنے اس عزیز کو کس حد تک شریک کیا؟ اپنے صاحب اثر عزیزوں دوستوں اور ملنے والوں کو اس کی اعانت پر کہاں تک توجہ دلائی، غرض یہ کہ اپنے ندوی ہونے کے فرائض کہاں تک ادا کئے؟ "جرمنی" جرمنوں کے لئے۔ "ہندوستان" ہندوستانیوں کے لئے۔ ان دونوں کے نعرے آپ نے بارہا سُنے ہونگے آپ کا مصرعہ بھی اسی ردیف و قافیہ میں یہ ہونا چاہیئے "ندوہ، ندویوں کے لئے" بلحاظ حقوق بعد کو بلحاظ فرائض پہلے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اپنی اس انجمن پر دل سے توجہ کریئے اسے فعال بنائیے کوئی انجمن اس طرح زندہ نہیں رہ سکتی کہ بس سال میں ایک جلسہ کر ڈالا اور سال بھی اس طرح کہ کبھی ۲۴ ماہ بعد کبھی ۳۶ ماہ بعد اور کبھی اس کے بھی بعد اس باب میں سب سے بڑی ذمہ داری ان طلبہ کی ہے جو مرکز میں مقیم ہیں اور ندوہ سے کسی طرح وابستہ ہیں ان میں بعض پیکر عمل بھی ہیں اور ان کی معمولی سی توجہ و مستعدی اس مشکل کو حل اور اس داغ کو انجمن کے دامن سے دور کر سکتی ہے۔

ترتیب کے لحاظ سے تیسری اور آخری لیکن اہمیت کے اعتبار سے سب سے مقدم گزارش یہ ہے کہ اپنی خودی کو خود فراموشی سے نہ بدلئے اپنی خودی کو ہمہ وقت بیدار رکھئے۔ ندویت نام ہے قلم سے زبان سے قلب سے جہاد فی سبیل اللہ کا فرنگیت سے کفر کا اپنے پر ایمان اور اعتقاد کا۔

اے اسیر رنگ پاک از رنگ شو
مومن خود کافر از فرنگ شو
دانی از افرنگ واز کار فرنگ
تا کجا در قید زنار فرنگ

آپ کے درس ندویت کی بائے بسم اللہ بھی یہی تھی اور تائے تمت بھی یہی۔ یہی مبتدا اور یہی منتہا چاہیے کہ یہی آپ کا مقصد وجود رہ جائے یہی اس کی غایت زندگی بن جائے زبان پر جاری یہی حال اور دل پر قائم یہی حال رہے اللہ کی وسیع دنیا میں چلئے پھریے، ملئے جلئے لیکن خیال یہ رہے کہ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے کہ آپ ہیں اللہ کے سپاہی پُتلے بن جائیے غیرت دینی کے پیکر سوختہ حرارت ایمانی کے۔ بگڑ جائیے اس سے جو آپ کے دین کا تمسخر کرے، لڑ جائیے اس سے جو آپ کے آقائے نامدار سے گستاخی کی جرأت کرے۔ انھیں نکال دیجئے جو آپ سے قرآن کی طرف ترچھی نظروں سے دیکھے تعلقات عمر بھر کے توڑ لیجئے اس بدبخت سے جو ارتداد کی راہ کھولے، یہی آپ کی جماعت کا سب سے بڑا تمغۂ امتیاز ہے اور سب سے بڑا شرف و افتخار۔

کریم و کارساز مالک و مولیٰ چلا اپنی مرضیات پر ہم سب کو ہمارے بڑوں کو اور چھوٹوں کو ہمارے دوستوں کو عزیزوں کو ہمارے رفیقوں کو، شریکوں کو لبریز کر دے ہمارے سینوں کو اپنے دین کی عصبیت سے اپنے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام کی غیرت سے دنیا گُل جائے تجھ سے بغاوت پر غداری پر ہم کو استوار رکھ اپنے رسول کی اپنے کتاب کی وفاداری پر جنہیں تو تری عظمت

(بقیہ صفحہ ۱۸ پر)

پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم

مولانا عبد الماجد کی تنقیدی بصیرت

☆

تنقید شعور کی ایک ترقی یافتہ منزل ہے اور اپنی اعلیٰ سطح پر فلسفہ، منطق، سائنسی ذوق اور فکری بصیرت کے دائرہ کی چیز بن جاتی ہے جس کا تعلق محض ذوق ادب سے نہیں رہ جاتا۔ ہمہ گیر شعور حیات کا جز بنا کر ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ تنقید اپنے وسیع ترین مفہوم میں کائنات اور اس کے مظاہر کی طرف سوچا سمجھا ذمہ دارانہ رویہ ہے، جس کا استعمال ایک محدود پیمانہ پر شعر و ادب کے سلسلہ میں کیا جاتا ہے اور اسے ہم اول تنقید کا نام دیتے ہیں لیکن اسے عام تنقیدی شعور سے ماورا قرار نہیں دے سکتے۔ ادبی تنقید کا ملکہ اور رجحان اپنی ابتدائی شکل میں فطری ہوتا ہے لیکن اس کا نشو و نما علم و آگہی ریاضت اور مطالعہ وسیع النظری اور صداقت نگاہ کی مدد سے ہوتا ہے کسی ادبی مسئلہ یا ادبی تخلیق کے متعلق محض ہیجانی یا جذباتی ردعمل سے عام طور سے تنقیدی بلندی تک نہیں پہونچتا حالانکہ ایک ذکی الحس نقاد اپنے سرمایۂ فکر کی بنا پر اس صورت میں بھی گہرے اور بصیرت افروز خیالات پیش کر سکتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی ذہانت اور وسیع مطالعہ کی مدد سے تشریح، تجزیہ، تعبیر اور محاکمہ کی دشوار گزار راہ ایک ہی لمحہ میں طے کر لیتا ہے اور آورد میں آمد کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ مولانا عبد الماجد کے ادبی اور تنقیدی مضامین پڑھ کر میرا ذہن انھیں باتوں کی طرف جاتا ہے اور میرے سامنے ان کی وہ تحریریں بھی گھومنے لگتی ہیں جو میرے محدود معنی میں تنقید ادب سے متعلق نہیں کہی جا سکتیں لیکن جو اسی سلسلہ کی ایک کڑی اور اسی طرز فکر کا ایک پرتو ہوتی ہیں۔

اردو میں شاذ و نادر ہی ایسے ادیب ہوں گے جو قرآن و حدیث، تصوف و اخلاق، فلسفہ و نفسیات، سوانح و سیرت، سفرنامہ اور ڈائری، سیاسی موضوعات اور سماجی مسائل، شاعری اور تخلیقی نثر، افراد اور تحریکات کے متعلق بے تکلفی اور ادبی لطافت کے ساتھ اظہار خیال میں تازگی، لطف زبان، نشتریت اور بلاغت بھی یہ ساری خوبیاں مولانا عبد الماجد دریابادی کی تحریروں میں پائی جاتی ہیں۔ انہوں نے جتنا اور جو لکھا ہے غور و فکر کے پیمانہ میں ڈھال کر لکھا ہے یا قلم برداشتہ لکھا ہے۔ فرمائش پر لکھا ہے یا کسی مخصوص تخلیقی جذبہ کے تحت، سب میں ایک ادبی آن اور حسین اسلوبی شائستگی نظر آتی ہے یہ قدرت ہر قلم میں نہیں ہوتی کہ وہ مختلف موضوعات کے مناسب آہنگ بھی موجود ہو جو اسلوب اور طرز ادا کی پہچان بن جائے۔ مولانا دریابادی کی تصنیفی عمر ۵۵۔ اور ۔ ۶۰ سال کے درمیان ہوگی جب انہوں نے اس وادی میں قدم رکھا اس وقت اردو نثر کی اسالیب کے متنوع رجحانات کا آئینہ خانہ بنی ہوئی تھی اور ہر دہائی میں انکی تعداد بڑھتی جاتی تھی سرسید، خواجہ حالی، محمد حسین آزاد، علامہ شبلی، سرشار اور مولانا شرر ان میں سے کون ہے جس کے جادو اور اثر کا انکار کیا جا سکے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنا سکہ رواں کیا ہر ایک کے مقلد پیدا ہوئے ہر ایک نے اردو نثر کے حسن میں چار چاند لگائے۔ ہر ایک نے ہی دنیا تک کے لئے اپنا نقش بٹھا گیا نا ممکن تھا کہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں کوئی من چلا ادیب بننے کے شوق میں قلم اٹھائے اور ان میں سے ہر ایک کے دام سے بچ کر نکل جائے پھر لکھنے والوں کی دوسری کھیپ آئی جو ادبی حسن کاری کے نقطۂ نظر کے پہلے گروہ سے کچھ آگے ہی تھی کیونکہ اس نے ایک طرف تو اپنے پیش رووں سے اثر قبول کیا تھا دوسری جانب مغربی ادب کے خزانوں کی کنجیاں بھی ان کے ہاتھ میں تھیں۔ مولانا ابو الکلام آزاد، محمد علی مہدی، افادی، نیاز فتحپوری، سجاد حیدر یلدرم، ناصر علی، دلگیر، رسوا، حسن نظامی، سجاد انصاری اور دوسرے نثر نگار تھے جنھوں نے تخیلی اور تخلیقی نثر کان گوشوں کو منور کیا جنھیں حالی اور ان کے ساتھیوں کی توجہ نصیب نہیں ہو سکی تھی۔ ان میں سے ہر ایک کا لہجہ ہے، ایک طرز ہے ایک سلیقہ ہے جو انھیں کے ساتھ مخصوص ہے ان کی آوازیں کہیں ایک دوسرے سے مل بھی جاتی ہیں ایک دوسرے سے ٹکراتی بھی ہیں لیکن اپنی انفرادیت نہیں کھوتیں۔ اتنا ضرور ہے کہ بعض کا دائرہ عمل محدود ہے، موضوعات محدود ہیں اور شاید ذہن کی پرواز بھی محدود ہے لیکن بعض وسیع میدانوں میں گشت لگاتے اور ہر جانب بڑھنے اور پرواز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ابو الکلام آزاد اور نیاز فتحپوری کو اس نوع میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

بہرحال مولانا عبد الماجد دریابادی کے سامنے یہی نمونے تھے کیا انہوں نے اس میں سے کسی کا تتبع کیا؟ یہ سوال صرف اسلوب کے متعلق نہیں طرز فکر کے بارے میں بھی پوچھا جا سکتا ہے انیسویں صدی ہی سے اردو ادب نے مغربی اثرات قبول کرنا بھی شروع کر دیا تھا جس کے واضح نقوش سرسید کی تحریک میں ملتے ہیں، بعد میں اس کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا اور فکر و خیال ذوق و اظہار کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرنے لگا تھا۔ مذہب، اخلاق، ادب، فلسفہ، تعلیم، تفریح اور طرز معاشرت غرض زندگی کا کوئی اہم شعبہ ایسا نہ تھا جس پر ان اثرات نے اپنا نقش نہ چھوڑا ہو۔ نئے تعلیم یافتہ طبقہ نے بھی غور و فکر کے بعد اور کبھی بنا کسی حد تک تقلیدی انداز میں مغربی افکار و اسالیب کو اپنانے کی کوشش کی تھی۔ طالب علمی کے دور سے مولانا دریابادی کا مطالعہ بہت وسیع اور ذہن اثر پذیر تھا اس لئے اگر انہوں نے یورپی ادب اور فکر کے اثرات قبول کئے تو یہ حیرت کی بات نہیں، لیکن کیا یہ یقین سے کسی مخصوص ادیب یا نقاد کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جس کی پیروی ادبی نقطۂ نظر اختیار کرنے میں انہوں نے کی ہو!

ایک اور حیثیت سے بھی کوئی مخصوص اثر قبول کرنے کا سوال زیر بحث لایا جا سکتا ہے۔ آج تو ایک مصنف اور نقاد کے سامنے بہت سے راستے ہیں اور ہر وہ ادبی نقطۂ نظر اختیار کرنے میں شعوری یا غیر شعوری طور پر کسی مکتب فکر سے وابستہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً جہاں تک تنقید کا تعلق ہے تشریحی، تاثراتی، نفسیاتی، جمالیاتی، سماجی، تاریخی، رومانی، کلاسکی، فنی، فلسفیانہ طریق کار رائج ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے وکیل اور طرفدار مل جاتے ہیں لیکن ۴۰۔۵۰ سال پہلے یہ تقسیم واضح نہ تھی۔ حالی، آزاد اور شبلی کے ادبی نقطۂ نظر میں ایک دوسرے سے اختلافات تھا لیکن اتنا نمایاں نہ تھا کہ ایک کا اثر دوسرے کی نفی قرار دیا جائے۔ مولانا عبد الماجد دریابادی کا ذوق تنقید اسی فضا میں پروان چڑھا اور جب ادبی موشگافیوں نے کئی مکاتب نقد پیدا کردے اس وقت ان کا انداز نظر اور اسلوب بیان اپنی راہ بنا چکے تھے۔ مولانا دریابادی کے طرز تنقید پر غور کرتے ہوئے یہی باتیں سامنے آتی ہیں اور ان کے طریق کار کی لچک انھیں ہر تقلید اور ہر دبستان سے الگ کر دیتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ابتدا میں انہوں نے آزاد اور شبلی کا رنگ پسند کیا ہو، مہدی افادی، حسن نظامی، سید سلیمان ندوی نے متوجہ کیا ہو، رسکن آسکر وائلڈ، والٹر پیٹر کے اسلوب نے گدگدی پیدا کی ہو، لیکن شروع ہی سے ان کی ادبی سوجھ بوجھ اور طرز اظہار میں کوئی ایسی بات ضرور ملتی ہے جو خود انھیں کی ہے اگر کسی جملہ کی ساخت مولانا محمد حسین آزاد سے مل جاتی ہے تو تحریر کا دوسرا حصہ شبلی کی یاد دلاتا ہے اور تیسرے میں ابو الکلام کی خطابت جھلکتی ہے اور طنز کا نشتر لوگوں میں دور تک اترتا دکھائی دیتا ہے۔ پھر جب مکمل تحریر پر نظر ڈالی جائے تو وہ اپنا تاثر ایک امتیازی اور انفرادی اسلوب کی حیثیت سے چھوڑتی ہے۔ ہر دوسرے ادیب سے مختلف اور ہر تنقیدی اسلوب سے الگ۔

مولانا عبد الماجد دریابادی کی تنقیدی بصیرت پر نگاہ کرتے وقت اس بات کا یاد رکھنا ضروری ہے کہ ایک ادیب کے نقطۂ نظر کی تشکیل میں وہ سارے عناصر کام کرتے ہیں جو نقاد کے ذہن پر چھائے رہتے ہیں۔ انہوں نے مذہبیات، علوم اخلاق، نفسیات، سماجی محرکات، تاریخ افکار، تصوف، ادبیات اور شخصیات ہر ایک سے گہری دلچسپی لی ہے۔ مطالعہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔ طالب علمانہ دور چھوڑ کر تقریباً ساٹھ سال سے یہ شغل غور و فکر کے ساتھ جاری ہے اور اس کے علمی نتائج ہزارہا صفحات کی شکل میں بکھرے ہوئے ہیں جن کے تنوع کا حال یہ ہے کہ اگر اس میں ایک طرف زود پشیماں ہے تو دوسری جانب نصیر ماجدی، ایک جانب ہلکے پھلکے موضوعات پر نثری مضامین کا سلسلہ تو دوسری جانب تصوف اسلام، ایک طرف فلسفہ اجتماع ہے تو دوسری طرف مختصر تبصرے اور کتابوں کے پیش لفظ ان سب کے اندر ایک ہی روح کار فرما ہے، ایک خاص طرح کی تنقیدی بصیرت جو تاثراتی اور شخصی ہوتے ہوئے بھی کاسات (؟) رنگ رکھتی ہے۔ اپنی بات کہنے کے جوش میں

از: مولانا رئیس احمد جعفری ندوی مرحوم

مولانا عبدالماجد دریابادی

ایک کامل المعیار انسان

مولانا سید رئیس احمد جعفری ندوی جامعی، مولانا عبدالماجد دریابادی کے خصوصی معتقدوں میں تھے، افسوس کہ چند سال ہوئے وہ یکایک مرض قلب کے حملے سے وفات پاگئے، ان کا ارادہ مولانا دریابادی پر ایک مستقل کتاب لکھنے کا تھا لیکن اس ارادہ کو پورا کرنے سے قبل ہی وہ چل بسے۔ اُن کا ایک مقالہ بعنوان مولانا دریابادی پر، ان کی کتاب دید و شنید میں (جو پہلی بار ۱۹۴۳ء میں کتاب منزل لاہور سے شائع ہوئی تھی اور اب نایاب ہے) "مولانا عبدالماجد دریابادی ایک کامل المعیار انسان" کے عنوان سے درج ہوا تھا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر وہ مولانا کی سوانح حیات لکھتے تو وہ کس شان و آن کی ہوتی۔

ایک زمانہ تھا کہ مولانا عبدالماجد ایک بہترین انشا پرداز، ایک صاحب طرز مصنف اور مؤلف ایک سنجیدہ مفکر اور فلسفی کی حیثیت سے مشہور انام اور مرجع خواص بنے ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ وہ مذہب کے منکر تھے، ارتیاب، تشکیک اور الحاد و دہریت کے علم بردار تھے، لیکن ان کی لامذہبی آزاد خیالی اور ترقی پسندی، بھی اپنے اندر ایک آن رکھتی تھی۔ اُس میں ایک وزن تھا، وقار تھا، وہ مذہب کا مذاق نہیں اڑاتے تھے نہ اُس کے خلاف دلائل رکھتے تھے اور سنجیدہ بحث کرتے تھے۔ انہوں نے علامہ شبلی کی "الکلام پر ایک تنقیدی نظر" طالب علم کی حیثیت سے ڈالی اور سنجیدگی، متانت اور وقار علم کے ساتھ ان کے مذہبی دلائل کی ایسی مخالفت کی کہ وہ بھی ان کی ذہانت، قوت فکر اور جولانی طبع کے قائل ہوگئے۔

پھر وہ دور آیا کہ

وہی ریاض جو تھے بُت پرست بادہ پرست
خدا کی یاد میں بیٹھے ہیں سر جھکائے ہوئے

مذہب نے ان پر اثر کیا اور ان کا اوڑھنا بچھونا مذہب بن گیا، تاریخ ہو یا فلسفہ، سیاست ہو یا معاشرت، ہر چیز کو وہ خالص اسلامی حیثیت سے دیکھنے اور پرکھنے لگے۔ داڑھی منڈی تھی بڑھ گئی۔ کوٹ پتلون نے کنارہ کشی اختیار کرلی موٹے کھدر کا کُرتہ اور پاجامہ، ٹوپی اور عبا، ان عناصر اربعہ نے مستقل لباس کی صورت اختیار کرلی، بزم و انجمن کی رنگینیاں رخصت ہوگئیں۔ مسجد و خانقاہ سے دل لگنے لگا۔ علوم عصریہ اور افکار جدیدہ اور حوادث حاضرہ کے مطالعہ و مشاہدہ کا سلسلہ اب بھی جاری تھا لیکن زیادہ وقت اب صرف ہونے لگا، قرآن پر، تفسیر پر، حدیث رسولؐ پر، سیرت نبویؐ پر، حیات صحابہ و تابعین پر۔ پہلے فلسفہ پر ایک فنکار کی حیثیت سے لکھتے تھے۔ اب اس فن کو ایک بڑے مقصد — اسلام — کی تائید میں صرف کرنے لگے، جب تک لامذہب تھے، دوسروں کو اپنانے سے بے نیاز تھے، مسلمان ہوئے تو ساری دنیا کو اسی دین پر عمل پیرا دیکھنے کی آرزو کرنے لگے، قلم میں قدرت نے بے پناہ کشش اور قوت ودیعت کردی تھی، فلسفہ جذبات ہو یا تصوف اسلام۔ یہ کشش ہر رنگ میں موجود ہے۔

مجھے جب کتابوں کے لکھنے پڑھنے کا ذوق پیدا ہوا اور میں ان کے نام نامی و اسم گرامی سے واقف ہوا تو یہ سچ سے مولانا بن چکے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد ان کا یگانہ اور منفرد اخبار "سچ" جس کا نام اب "صدق" ہے نکلا پہلا نمبر دیکھا۔ طرز تحریر ایسا بھایا کہ میں اس کے مستقل قارئین میں شامل ہوگیا۔ ان کی لکھی ہوئی ایک ایک سطر اور ایک ایک حرف کو والہانہ ذوق و شوق کے ساتھ پڑھنا مجنونانہ جوش و خروش کے ساتھ دوستوں کو سُنانا۔

یوپی کی حکومت نے ہندوستانی اکیڈمی کے نام سے ایک علمی و ادبی ادارہ قائم کیا اسکے جو ممبر سرکار نے نامزد کئے ان میں مولانا عبدالماجد بھی تھے مجھے ایک سرکاری ادارہ میں ان کی شرکت پسند نہ آئی۔ جذبۂ عقیدت کو ٹھیس سی لگی، فوراً ایک خط لکھا کہ آپ محرم کے زمانہ میں مسلمانوں کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ حسینؑ بن علیؓ کے نقش قدم پر چلیں۔ باطل کا مقابلہ کریں اور ناحق سے برسر جنگ ہوں، دوسری طرف آپ خود وقت کے یزیدوں اور فرعونوں کے بنائے ہوئے اداروں میں شریک ہوتے ہیں، آخر یہ کیا ستم ظریفی ہے؟ . . . " یہ خط میں نے "مقتدر حسین جعفری" کے نام سے لکھا کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ انھیں میرا نام معلوم ہو دوسرے پرچہ میں "مقتدر حسین صاحب جعفری" سے خطاب کیا گیا کہ آپ اپنا پتہ لکھئے، آپ کا جواب دیا جائے گا میں نے اپنے دوست حامد علی مدیر "خضر راہ" کے ذریعہ جواب مانگا۔ جواب آیا ملاقات کیجئے تو گفتگو ہو اب مقتدر حسین کا جواب حائل اٹھا نظر آرہا تھا۔ بڑی کشمکش میں تھا، ملوں یا نہ ملوں۔ آخر ہرچہ بادا باد کہہ کر میں نے پھر ایک خط لکھا کہ میرا نام مقتدر حسین نہیں رئیس احمد ہے، میں ندوہ کا طالب علم ہوں، مصلحتاً میرا نام بدل دیا تھا اگر آپ خفا نہ ہوں تو ملنے آؤں فوراً جواب آیا۔ "خفا؟ آپ ایک نوعمر عزیز کی حیثیت سے ملنے آئیے؟ خفگی کی کیا بات ہے؟"

اب ذرا ڈھارس بندھی اور دوسرے روز خاتون منزل — گولہ گنج — میں پہونچا، اوپر اطلاع کرائی تھوڑی دیر کے بعد طلبی ہوئی۔ دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے ہوئے قدموں کے ساتھ اندر پہونچا بزرگانہ شفقت اور محبت سے پیش آئے، دہشت نکل گئی، اُنس سا پیدا ہوگیا۔ میں نے دیکھا، ایک ہاتھ زخمی سا نظر آرہا ہے پٹی بندھی ہوئی ہے، سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا عہد طفلی میں ہاتھ پر اپنا نام کھدوا لیا تھا، پھر تجدید اسلام کے بعد کتب مذہبی میں اسکے خلاف وعیدیں دیکھیں فوراً ڈاکٹر کو بلایا، ہاتھ اس کے سامنے بڑھا دیا کہ اس کے کئی انچ کے لمبے اور چوڑے حصہ کو اتنی پوری کھال کو کھرچ دو، تراش دو، ڈاکٹر نے افہام تفہیم کی کوشش کی لیکن ناکام ہوا اور آخر آپ کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی یہ وہی زخم تھا جس کے کئی دنوں سے ڈریسنگ ہو رہی تھی اور جس کے مندمل ہونے میں ابھی کئی ہفتوں کی مدت باقی تھی۔ زخم دیکھ کر اور زخم سے زیادہ یہ عزم و استقامت فی الدین دیکھ کر میرے تو واقعی رونگٹے کھڑے ہوگئے دل نے کہا یہ ہے وہ خضر راہ تحت الشعور میں جس کی تلاش تھی، خوبیٔ قسمت کہ آج وہ آنکھوں کے سامنے ہے ؎

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

ڈریسنگ اور علاج کے سلسلہ میں جب تک مولانا لکھنؤ میں مقیم رہے، میں بڑی پابندی اور کثرت سے ملتا رہا۔ رفتہ رفتہ وہ تعلق پیدا ہوگیا جو ایک خادم اور مخدوم میں خورد اور بزرگ میں ہوتا ہے اور خدا کے فضل سے یہ تعلق اور اختصاص روز بروز پائندہ تر اور مستحکم تر ہوگیا۔

میں گیا تھا ایک باغی کی حیثیت سے، واپس آیا تو دل عظمت اور محبت کا سرچشمہ بن چکا تھا۔

مولانا کی تربیت کا خاص وصف یہ ہے کہ وہ مخاطب کو "عبد ذلیل" اور اپنے تئیں "رب جلیل" سمجھ کر گفتگو نہیں کرتے، نہ گفتگو میں واعظانہ اور ناصحانہ رنگ غالب ہوتا ہے، وہ باتوں باتوں میں نہایت سادگی کے ساتھ اپنا خیال اس طرح آپ کے دل میں پیوست کردیں گے کہ وہ آپ کا خیال بن جائے گا۔ کچھ عرصہ تک اگر انکے فیض صحبت سے کسی کو مستفید ہونے کا موقع ملے تو وہ ان کی آنکھوں سے دیکھنے لگے گا اس لئے کہ یہ اس دلسوزی اور اپنائیت سے شکوک دور کرتے ہیں، اس خلوص اور سچائی سے دلائل پیش کرتے ہیں اور تحقیق و تفصیل سے صورت مسئلہ پر گفتگو کرتے ہیں کہ ان کی بصارت، مخاطب کی بصارت بن جاتی ہے، ان کی ذکاوت اس کی ذکاوت بن جاتی ہے۔ یہ اپنے خیالات کسی پر ٹھونستے نہیں اپنے خیالات کا جال اس خوبی سے پھیلاتے ہیں کہ اس سے نکلنا مشکل ہوجاتا ہے۔

مولانا طنزیات کے بادشاہ ہیں، نثر میں رعایت لفظی اس کمال سے استعمال کرتے ہیں کہ سہل ممتنع کا مزا آجاتا ہے، طرز تحریر اتنا دلنشیں کہ ؎

بلائے جاں ہے غالبؔ اسکی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

اور پھر لطف یہ کہ جس موضوع پر لکھیں گے اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے طرز تحریر بھی ایسا ہی رکھیں گے جو موضوع سے مناسبت رکھتا ہو، ایک ہی قلم ہے جس نے تاریخ اخلاق یورپ بھی لکھی اور "فلسفۂ جذبات" بھی جس نے "تصوف اسلام" بھی لکھی اور فلسفۂ اجتماع بھی، جس نے مثنوی بحر المحبت (مصحفی) بھی مرتب و مہذب کی اور "مکالمات برکلے" بھی جس نے "سفرنامۂ حجاز" بھی لکھا اور "جو سچی باتیں" بھی لکھتا ہے۔ ان میں ہر ایک میں انفرادیت کی پوری شان قائم ہے، طرز تحریر کہیں معلم کا

ہے، کہیں مترجم کا، کہیں فلسفی کا، کہیں انشا پرداز کا، کہیں ادیب کا، تاریخ اخلاق یورپ شستہ اور رواں ترجمہ ہے، فلسفہ جذبات اور فلسفہ اجتماع کا انداز تحریر باوقار اور سنجیدہ ہے، تصوف اسلام اور فیہ ما فیہ میں تصوف کی متانت غالب ہے۔ سفر حجاز میں قلم ایسے مصور کا موقلم بن جاتا ہے جو دل کے جذبات کو، تصور کی جلوہ آرائیوں کو، عقیدت و احترام کے تاثرات کو محسوس اور مرئی صورت میں دکھا سکتا ہے، ہر مصنف کو اپنے قلم پر یہ قدرت نہیں ہوتی۔

فلاسفہ کی خشک مزاجی، علما کی تمکنت اور صوفیا کی ــ بقول ع

"خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید"

ہمارے مولانا ان تینوں نعمتوں سے مالا مال ہیں، وہ فلسفی بھی ہیں، عالم بھی ہیں اور صوفی بھی۔ ان میں فلسفی کا وقار، عالم کا جلال، صوفی کا سکوت سب کچھ ہے لیکن حد کے اندر۔ اُن سے آپ گفتگو کیجئے۔ ان کی مجلس میں بیٹھئے۔ کسی طرح اُن سے قرب کا شرف حاصل کر لیجئے پھر آپ دیکھیں گے کہ یہ ملک کا بہت بڑا فلسفی، کتنا شگفتہ مزاج ہے، یہ قرآن کا مترجم و مفسر کتنا بذلہ سنج ہے۔ یہ اسرار تصوف کا رمز آشنا، اپنی گفتگو میں شوخی کی چاشنی، طنز کے تیر، رعایت لفظی کی صنعت، غرض کیا کچھ نہیں رکھتا، پھر موقع موقع سے اساتذہ کے اشعار، ہر رنگ شاعری کے ادا شناس، مثنوی مولانا روم سے لے کر اکبر تک۔ امانت سے لے کر داغ تک، ہر استاد کے اشعار یاد۔

ادب ہو یا لٹریچر، فن ہو یا آرٹ، سینما ہو یا اکر، اخبار ہو یا رسالہ، کتاب ہو یا مخطوط، سیاست ہو یا صحافت، یہ سب سے اپنا کام لیتے ہیں، کسی کا آلۂ کار نہیں بنتے، ریڈیو رکھتے ہیں لیکن حظ نفس کے لئے نہیں، شیطان کی ترقیاں دیکھنے کے لئے۔ لندن اور امریکہ کے نسوانی رسالے خیالی کے میگزین، آرٹسٹوں اور فنکاروں کے صحائف دیکھتے ہیں اور بغور دیکھتے ہیں، لیکن صرف اس لئے کہ معلوم کریں کہ دختران مغرب کا اخلاقی زوال کس حد عروج تک پہونچ چکا ہے۔ نت نئے فیشنوں نے کیسے بھیانک اقتصادی اور اخلاقی زوال کی بنیاد ڈال دی ہے، آرٹ اور فن کے نام پر آدم کے بیٹے اور حوا کی بیٹیاں کیا کچھ نہیں کر رہی ہیں؟

علما کا احترام کرتے ہیں، بزرگوں کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن تقلید اعمٰی سے گریز کرتے ہیں اور اپنی رائے بے خوف لومۃ لائم پورے استقلال و استقامت، بیباکی و صفائی سے ظاہر کردیتے ہیں۔ نہ جھجکتے ہیں، نہ تامل کرتے ہیں۔ مولانا حسین احمد صاحب کے مرید ہیں لیکن سیاسیات میں ان کے مسلک سے یہ سخت اختلاف رکھتے ہیں اور اس کے اظہار میں بھی تامل نہیں کرتے۔ مولانا اشرف علی ان کی نظر میں حکیم الامت تھے، تھانہ بھون ہر سال کسب فیض کے لئے جایا کرتے تھے اور بجنون رہتے تھے لیکن اس عقیدت کے باوجود متعدد مسائل اور امور ایسے تھے جن میں حکیم الامت کا مسلک کچھ اور تھا اور ہمارے مولانا کا کچھ اور۔ اور اس کے اظہار میں انہوں نے کبھی مداہنت نہیں کی۔ محمد علی سے محبت و عقیدت کا یہ عالم ہے کہ آج بھی ؎

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے

جس دن سے ان کا انتقال ہوا ملی سیاست سے عملی طور پر یک قلم دست کش ہو چکے ہیں، اُن کی دیانت و امانت اور اصابت رائے کا لوہا مانتے تھے لیکن کئی ایسی باتیں تھیں جن میں ان دونوں کے درمیان کبھی نہ بنی۔

ایک بڑی چیز ہے توازن، اکثر لوگ ایسے ہیں جو اس نعمت سے بہرہ ور ہوں یا افراط میں مبتلا ہیں یا تفریط میں۔ مولانا کو خدا نے توازن کے ساتھ وہ سلامتی فکر عطا کی ہے جو افراط و تفریط سے بہت دور ہے۔ وہ کٹر حنفی ہیں لیکن غیر مقلدوں کے دشمن نہیں۔ وہ سیاسیات میں مسلم لیگ اور پاکستان کے قائل ہیں لیکن نیشنلسٹوں کو اچھوت نہیں سمجھتے اور وہ اپنے سنی ہونے پر ناز کرتے ہیں لیکن شیعوں کو مسلمان سمجھتے ہیں جس کے مخالف ہیں اس کی حمایت کر سکتے ہیں وہ ظاہر کو بھی دیکھتے ہیں اور باطن کو بھی وہ ان میں سے کسی ایک پر فیصلہ نہیں کردیتے ان کا فیصلہ ہر دو پر مبنی ہوتا ہے۔

وہ ہنستے بھی ہیں اور روتے بھی ہیں، ہنساتے بھی ہیں اور رُلاتے بھی ہیں ہنستے ہیں تو اُن کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں، روتے ہیں تو آنکھوں سے آبدار موتیوں کی بارش ہونے لگتی ہے ہنساتے ہیں تو فضا کو باغ و بہار بنادیتے ہیں، رُلاتے ہیں تو دل میں گداز و سوز پیدا کردیتے ہیں۔ ان کے پاس نشاطِ حیات کو قربان نہیں کرتے اور نشاطِ حیات کے مقابلے میں فکر کرتے ہیں اور زندگی سے لطف بھی لیتے ہیں۔ وہ ورزش بھی کرتے ہیں، واکنگ WALKING بھی کرتے ہیں نماز بھی پڑھتے ہیں اور روزہ بھی رکھتے ہیں۔ وہ رات کو جاگتے بھی ہیں اور سوتے بھی ہیں، جاگتے وقت جاگتے ہیں، سونے کے وقت سوتے ہیں۔ آرام کے وقت آرام کرتے ہیں اور کام کے وقت کام۔ ایک کامل المعیار انسان میں اس سے زیادہ اور کیا صفات ہو سکتی ہیں۔!!

طلبائے ندوہ کے سالانہ میگزین "الاصلاح" کے لئے

مولانا دریابادی کے چند پیامات

مرتبہ: مزمل حسین

ندوی قلم، اپنی متانت، شرافت، علم دوستی اور اسلام پرستی کے لئے ملک بھر میں ممتاز ہے اور بالکل بجا اپنی شہرت قائم کئے ہوئے ہے۔

نئے طلباء کا کام اس — امتیاز و فخر کو قائم رکھنا نہیں اسے اور ترقی دینا ہے خصوصاً دین کی یہ اسلوب احسن نصرت و خدمت کی ضرورت آج تو بیشتر سے کہیں زائد ہے۔ والسلام

عبدالماجد ۱۹۵۰ء

آپ کے "عندلیب" سے ناواقف محض ہوں اس لئے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اس کی صدا کیا ہوتی ہے لیکن بہر حال یہ عندلیب "چمن ندوہ" ہی کا ہے قدرتاً اس کو نغمۂ روحانی سے زیادہ روحانی اور ناسوتی سے کہیں بڑھ کر لاہوتی ہونا چاہیئے۔ اسکی توقع ہے اور اسی کی آرزو۔ والسلام

ناچیز عبدالماجد ۱۹۵۱ء

کہنے اور سننے کی بات صرف ایک ہی ہے۔ مصلح بننے سے پیشتر صالح بننا ضروری ہے اور اصلاح نفس دوسروں کی اصلاح پر مقدم ہے۔

دعاگو عبدالماجد ۱۹۶۰ء

اصلاح کا شمار تو پیمبرانہ فرائض میں ہے، ان ارید الا الاصلاح ما استطعت، اس سے اونچا مقصد زندگی اور ہو کیا سکتا ہے جس نے اس فرض کو کسی درجہ میں بھی ادا کرلیا، اس نے اپنے ظرف و بساط کے لائق پیمبرے پیدا کرلی۔

البتہ اس سعی اصلاح میں اصلاح نفس سب پر مقدم اور سب سے اہم ہے۔ اپنی اصلاح پر توجہ کم رکھنا، حسن مقصد اصلاح ہی کو ضائع کردینا ہے۔ والسلام

عبدالماجد ۱۹۴۷ء

اپنا مقصد خود بھی اتنا بلند ہے کہ خارج کی ہر حوصلہ افزائی سے بے نیاز ہے، "شبلی و سلیمان" کی زبان و قلم کو اپنانا یقیناً ایک بڑی دولت اور بڑی سعادت ہے۔ اللہ ہر طرح کامیاب کرے۔

دعاگو عبدالماجد ۱۹۵۰ء

علی میاں سلمہ، کے ہوتے ہوئے آپ لوگوں کو کسی مزید رہنمائی اور مشورے کی ضرورت ہی کیا ہے، بس مسلک اسلامیت پر قائم رہیے۔ جوش و ہوش دونوں کی آمیزش کے ساتھ اور محمد علی مونگیری اور شبلی و سلیمان تینوں کو بطور نمونہ سامنے رکھئے اور نمونہ کے معنی تقلید جامد کے نہیں۔

اسلاف سلف کے جادۂ قدیم پر مستقیم رہیے جدید سے بھی محض اس کی جدیدیت کی بنا پر گریز نہ کیجئے، ہر زمانہ کے مقتضیات نئے ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر نسل کے فرائض بھی جداگانہ۔

والسلام

عبدالماجد ۱۹۷۰ء

آپ کی مجلہ "الاصلاح" کی اصلاحی کوششوں سے کون ناواقف ہے سب سے مقدم اصلاح، اصلاح نفس ہے۔ کوشش کرکے اس کی نیک نامی قائم رکھئے بلکہ اسے اور بڑھائیے، اور شبلی و سلیمان" کی تمنائیں ایک ایک کرکے پوری کیجئے۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے "مسلم" ہونے کا استحضار ہر آن اور ہر حال میں رہے۔

والسلام

عبدالماجد ۱۹۵۸ء

دار العلوم ندوۃ العلماء

لکھنؤ

عالم اسلامی کا مشہور دینی و علمی مرکز

الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام، علیٰ سید المرسلین وسیدنا ومولانا محمد وآلہٖ واصحابہٖ اجمعین۔

دار العلوم ندوۃ العلماء عالم اسلام کا مشہور دینی و علمی مرکز ہے جو پچاسی سال سے علم دین کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ عالم اسلام کی اس مشہور دینی درسگاہ کا قیام ۱۳۱۵ھ میں حضرت مولانا محمد علی مونگیری خلیفۂ اعظم حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی کے مبارک ہاتھوں عمل میں آیا۔ الحمد للہ ہر عہد میں یہاں سے ایسے فضلاء تیار ہو کر نکلے جنہوں نے وقت کی ضرورت اور عہد حاضر کے تقاضوں کے مطابق صحیح دینی عقائد و علوم دینیہ کی نشر و اشاعت کی اور اسوقت بھی بفضلہ تعالیٰ اس کے فضلاء ہندوستان اور بیرون ممالک میں علمی و دینی خدمات انجام دے رہے ہیں اور بفضلہ تعالیٰ یہ ادارہ موجودہ اخلاقی و دینی انحطاط کے دور میں بھی موثر علمی و دینی خدمات انجام دے رہا ہے۔ ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے ارکان میں ہندوستان کے ہر صوبہ کے منتخب علمی و دینی اہم شخصیتیں شامل ہیں۔

ندوۃ العلماء کے گزشتہ عظیم تعلیمی اجلاس (منعقدہ شوال ۱۳۹۵ھ مطابق نومبر ۱۹۷۵ء) جس میں دور دراز سے آئے ہوئے عرب اہل علم و اصحاب فکر حضرات نے کثیر تعداد میں شرکت فرمائی تھی، وہ بھی دار العلوم ندوۃ العلماء کی ان خدمات سے بہت متاثر ہوئے اور فضلاء ندوۃ العلماء کی علمی و دینی سرگرمیوں اور کارگذاریوں کو سراہا۔

اس وقت دار العلوم ندوۃ العلماء میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کے علاوہ تھائی لینڈ، ملیشیا، نیوزی لینڈ، ساؤتھ افریقہ وغیرہ کے طلباء بھی زیر تعلیم ہیں، ملکی و غیر ملکی طلباء کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے، جن میں تقریباً تین سو غیر مستطیع طلباء کے وظائف (اسکالرشپ) پر تقریباً ڈھائی لاکھ روپے صرف ہو رہے ہیں۔ حضرات مدرسین و اسٹاف کی تعداد ۸۰ سے زائد ہے۔ ہر سال جدید طلباء کے اضافہ کے باعث رہائش گاہ کا مسئلہ پیچیدہ ہوتا جاتا ہے، اس لئے کئی سال سے برابر تعمیری کام کچھ نہ کچھ جاری رہتا ہے۔ سالانہ مجموعی مصارف مع ضروری تعمیرات دس لاکھ روپے ہیں، ادھر چند برسوں سے روز افزوں گرانی اور بڑھتی ہوئی ضروریات کا جو سلسلہ چل رہا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دور ابھی کچھ عرصہ اور چلے گا۔

اس بات کا اندازہ کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے کہ جب ایک ایک فرد اور ایک ایک گھر اس گرانی سے کم و بیش متاثر ہے تو ان دینی اداروں کا جو عام مسلمانوں کے عطیات اور ان کی ہمدردی و تعاون کی بنیاد پر قائم ہیں اور جن کو سیکڑوں طالبعلموں کے اخراجات، قیام و طعام اساتذہ و عملہ کی تنخواہوں اور دوسرے کثیر مصارف کا ہر ماہ انتظام کرنا پڑتا ہے، کسقدر دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہوگا جب اس کا اثر اکثر افراد پر پڑا ہے تو دینی اداروں اور مدرسوں پر اس سے کہیں زیادہ پڑا ہے، اس لئے کہ ان کی ذمہ داری کا بوجھ افراد سے کہیں بڑھ کر ہے۔

مذکورہ بالا حالات کے پیش نظر اس وقت دار العلوم ندوۃ العلماء کی طرف (جس کی اہمیت موجودہ دور میں روز روشن کی طرح عیاں ہے) ہمارے مسلمان بھائیوں کو زیادہ اہتمام اور فیاضی و دریا دلی اور حوصلہ و ہمت کے ساتھ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

دار العلوم ندوۃ العلماء کی خدمات میں اُن اہل خیر حضرات کا بڑا حصہ ہے جو اس اہم کام کو اپنی ذاتی ضرورت سمجھتے ہیں اور وقتاً فوقتاً حسب استطاعت اعانت فرماتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس تعاون کو قبول فرمائے۔

اہل استطاعت حضرات سے خصوصیت کے ساتھ گذارش ہے کہ زیادہ سے زیادہ اعانت فرما کر موجودہ مشکلات میں دار العلوم کی ترقی میں معاون ہوں، نیز بطور صدقہ جاریہ تعمیرات میں بھی حصہ لیں اور اپنے نام سے یا اپنے مرحوم اعزا کی طرف سے ایصال ثواب کے لئے طلباء کی رہائش گاہیں تعمیر کرائیں۔ نئے دار الاقامہ کے ایک کمرہ پر دس ہزار روپیہ صرف کا تخمینہ ہے، یہ کمرہ ۱۸ × ۱۶ فٹ کے ہیں اور ان کے سامنے ۸ × ۱۸ فٹ کا برآمدہ ہے۔ ہر کمرہ میں چھ طلباء کے رہنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس جدید دار الاقامہ پر مصارف کا کل تخمینہ بارہ لاکھ روپے ہے۔

اس کے علاوہ ایک جدید دار الاقامہ (ہوسٹل) اور کتب خانہ اور اسٹاف کے رہائشی مکانات اور کتب خانہ وغیرہ کی فوری تعمیر کی ضرورت بھی ہے۔ نقشوں کا کام شروع ہو چکا ہے۔ اس طرح مدرسہ ثانویہ کی جدید عمارت کی تکمیل اور مسجد کی توسیع میں کچھ حصہ باقی رہ گیا ہے اس کا کام بھی مکمل کرنا ہے۔

یہ حقیقت قابل توجہ ہے کہ مسلمانوں کی ہر فلاح و بہبود ان کے اس دین سے وابستہ ہے جس کو لے کر حضور اکرم سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے، مسلمان جسقدر اس حقیقت کی طرف توجہ کریں گے اور جس قدر دینی کاموں میں دلچسپی اور بلند ہمتی سے حصہ لیں گے اسی قدر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی حفاظت و کامیابی کا فیصلہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

" ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم "

رمضان المبارک اور اس کے علاوہ مختلف اوقات میں بعض حضرات اساتذہ و سفراء دار العلوم کی مالی اعانت کے سلسلہ میں مختلف علاقوں میں تشریف لیجاتے رہتے ہیں۔ مقامی طور پر درد مند اہل خیر حضرات دلچسپی سے تعاون فرمائیں تو انشاء اللہ دار العلوم کی اعانت کا بڑا کام ہو سکتا ہے۔
اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی توفیقات خاص سے نوازیں اور اپنے دین کی نصرت و حمایت کی دولت سے سرفراز فرمائیں۔

خاکسار

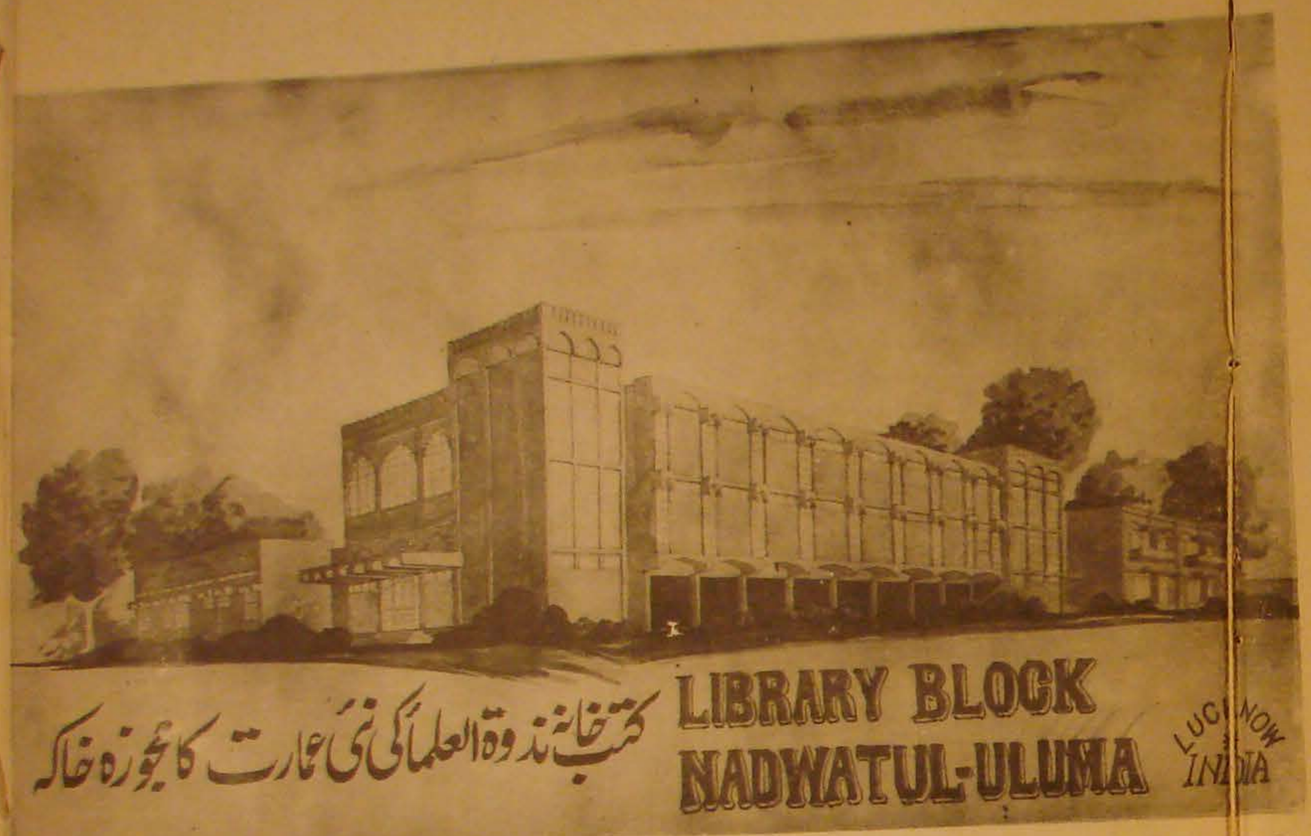

(مولانا سید) ابو الحسن علی ندوی

(ناظم ندوۃ العلماء)

نوٹ: امدادی رقوم ہمارے سفراء حضرات کو عنایت فرمائیں
یا رقوم چیک اور ڈرافٹ بنام ناظم صاحب
ندوۃ العلماء "ندوہ" لکھنؤ روانہ فرمائیں۔

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

مولانا عبد الماجد دریابادی

ذاتی تاثرات

سنہ ۱۹۲۶ء کا کوئی مہینہ تھا، میری عمر دس گیارہ سال کی تھی، میں اس زمانہ میں والد صاحب کے انتقال کی وجہ سے والدہ صاحبہ کے ساتھ اپنے وطن رائے بریلی میں رہتا تھا کہ اچانک ایک اخبار کسی کے ہاتھ میں دیکھا جس میں اُس زمانہ کے مشہور بزرگ مولانا سید عین القضاۃ صاحبؒ بانی مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ کی وفات کی خبر، ان کے انتقال کا واقعہ اور ان کے متعلق ایک مفصل مضمون تھا۔ یہ "سچ" کا پہلا پرچہ تھا جو نظر سے گزرا۔ بات بہت پرانی ہوگئی، مضمون تو غالباً مولانا کے مسترشد مولانا ظفر الملک صاحب علوی کاکوروی کا لکھا ہوا تھا جو اُس وقت شریک ادارت تھے لیکن لوح پر مدیر کی حیثیت سے نام مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کا تھا جو لوحِ دل پر اسی وقت سے نقش ہوگیا۔ غالباً اس سے زیادہ سیدھا سادہ عام فہم اور روزمرہ کسی پرچہ یا اخبار کا نام اس وقت ہندوستان میں نہ تھا لیکن اس کا ادبی معیار اس کے مضامین کی سطح میری عمر اور استعداد سے بہت زیادہ تھی، اس لئے اس عمر میں اس سے زیادہ استفادہ کا موقع نہ تھا اور نہ اس شمارے کے بعد کسی اور شمارے کا دیکھنا یاد آتا ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد میں اپنی تعلیم کی غرض سے لکھنؤ زیادہ تر اپنے بڑے بھائی حکیم ڈاکٹر مولوی سید عبد العلی صاحب کے پاس رہنے لگا۔ محمد علی "ڈائری" کے ابتدائی مضمون سے معلوم ہوا کہ مولانا عبد الماجد صاحب اپنے محبوب مولانا محمد علی جوہر مرحوم کی معیت میں ندوہ کے اجلاس کانپور (۱۹۲۶ء) میں شریک تھے۔ میں بھی ایک کمسن تماشائی کی حیثیت سے جس کے خاندان کا اس تحریک و ادارہ سے بہت قدیم اور گہرا تعلق تھا۔ اول سے آخر تک اجلاس میں شریک رہا۔ ہندوستان کے چوٹی کے مشاہیر عصر و دور زعماء کی اپنی عمر میں پہلی مرتبہ وہیں زیارت کی، حاذق الملک حکیم اجمل خاں تو خیر صدر جلسہ ہی تھے۔ مولانا ظفر علی خاں، مولانا سلیمان منصور پوری مصنف رحمۃ للعالمین، مولانا شاہ سلیمان پھلواروی اور کتنے ہی مشاہیر کو وہیں دیکھا، اُس وقت اچھی طرح یاد نہیں لیکن یہ بات ہر طرح قرین قیاس ہے کہ مولانا عبد الماجد صاحب کو پہلی مرتبہ وہیں اسٹیج پر مولانا محمد علی کے پہلو میں بیٹھا ہوا دیکھا ہو۔ لیکن شعور اور تعارف کی پہلی ملاقات اس کے ایک دو سال بعد ہوئی۔ نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب شروانی تشریف لانے والے تھے تو خیالی گنج کی کاکوری والی کوٹھی سے منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری کی نشست میں مولانا کی معیت و ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا۔ اگرچہ اس وقت کمسن سال نہیں تو کہنہ مشق ضرور ایک مشہور و معروف ادیب، فلسفی، مصنف، صحافی اور مفکر اور ایک ۱۲-۱۴ سال طالب علم کا کیا جوڑا! مولانا کو التفات بھی نہ ہوتا لیکن تعارف ہونے پر والد صاحب اور بھائی صاحب کے تعارف و تعلق سے بزرگانہ شفقت فرمائی گئی۔

اس زمانہ میں شیخ خلیل عرب سے پڑھتا تھا ان کا مکان بازار جھاؤ لال لکھنؤ میں عربی ادب و زبان کی تعلیم کا ایک مرکز بنا ہوا تھا۔ میری عربی تعلیم کی توسیع انہی کے ہاں ہوئی لیکن دار العلوم ندوۃ العلماء فرنگی محل اور لکھنؤ یونیورسٹی کے بہت سے منتہی طلبہ اور عربی ادب کے شائقین مختلف وقتوں میں وہاں استفادہ و تعلم کے لئے آتے تھے۔ یہ مختلف عمروں اور استعدادوں کے طالب علم تھے اور اکثر خارج وقت میں پڑھنے والے تکمیل کے طالب علم ہوتے تھے اس لئے ان سے زیادہ مناسبت اور یگانگت کی کوئی وجہ نہ تھی۔ میرے ایک ہی ہمعصر اور ہم سبق ساتھی تھے اور وہ عرب صاحب کے چھوٹے بھائی حسین عرب یا کچھ عرصہ کے بعد میرے چچازاد بھائی سید ابو الحسنی۔ تھوڑا زمانہ گزرا تھا کہ میرے ایک ہم عصر اور ہم سن طالب علم کا اضافہ ہوا یہ مولانا عبد الماجد صاحب کے بھتیجے حکیم عبد القوی صاحب تھے جن کو ہم لوگ انکے عرفی اور گھریلو نام آفتاب سے جانتے اور خطاب کرتے تھے۔ بھائی آفتاب صاحب کا مطالعہ اس وقت بھی ہم لوگوں کے مقابلہ میں وسیع اور متنوع تھا، وہ مولانا کے تعلق اور رشتہ سے مولانا محمد علی کے نام کے عاشق اور فدائی تھے اور ان کے تمام مخالفین اور معترضین سے سخت ناراض تھے۔ کچھ بزرگوار کے مطالعہ سے ظفر علی خاں کا رنگ چڑھا ہوا تھا اور سیاست اور ادب و شاعری سب میں ان کے گن گاتا تھا اکثر ہم دونوں کی نوک جھونک ہوتی اور عرب صاحب کے مکان کی دیوار کے نیچے گلی میں کھڑے ہوئے مناظرے ہوتے رہتے۔ ان کے ذریعہ مولانا کی تحریروں مضامین اور تصانیف کا نام اور حوالے کان میں پڑے۔

مولانا کی سب سے پہلی تحریر جو بھائی صاحب آفتاب کے ذریعہ پڑھنے کو ملی وہ مولانا کا وہ خطبۂ استقبالیہ تھا جو چند سال پہلے لکھنؤ میں ہونے والی خلافت کانفرنس کے لئے لکھا گیا تھا ایک نیم دینی اور نیم سیاسی جلسہ میں پڑھا جانے والا خطبہ تھا۔ لیکن سیاسی و دینی سے زیادہ اس پر ادبی رنگ غالب تھا اور وہ ایک سیاسی خطبہ ہونے کے بجائے ایک ادبی دستاویز اور مولانا کے طرز تحریر کا ایک اعلیٰ ادبی نمونہ بن گیا تھا، میں اس سے پہلے آزاد کی "آب حیات" "نیرنگ خیال" اور خالص ادبی چیزوں میں رتن ناتھ سرشار کا "فسانۂ آزاد" پڑھ چکا تھا۔ علامہ شبلی کی چند اہم ادبی تصنیفات بھی نظر سے گذر چکی تھیں اس لئے ادب اور زبان کا چٹخارہ پیدا ہوگیا تھا۔ اور اچھا برا سمجھنے لگا تھا، مولانا کا خطبہ بڑے لطف و ذوق سے پڑھا اور دل نے پہلی مرتبہ ان کے قلم اور زور بیان کا لوہا مانا۔ اسکے بعد جب کبھی مولانا کی خدمت میں حاضری ہوئی قدیم تعارف کے بعد بھائی آفتاب کی ہم مکتبی کی نسبت کا اضافہ ہوگیا جو مولانا کے لئے قدرتاً کشش اور مزید شفقت کا ذریعہ بن گئی، اور اس طرح اس محبت و شفقت میں جدید آب و تاب پیدا ہوگئی۔

یہی زمانہ تھا جب مولانا عبد الماجد صاحب نے مولانا حسین احمد مدنی سے بیعت و استرشاد کا تعلق پیدا کیا، میرے بڑے بھائی ڈاکٹر صاحب نے بھی اسی زمانہ میں مولانا سے تعلق پیدا کیا اور تھوڑے ہی دنوں میں ان کا گھر لکھنؤ میں مولانا کی مستقل فرودگاہ بن گیا۔ اس جدید روحانی رشتہ سے مولانا عبد الماجد صاحب اور مولانا عبد الباری صاحب ندوی کی جلد از جلد زیارت ہونے لگی۔

سنہ ۱۹۲۹ء میں مولانا نے حج و زیارت سے فراغت حاصل کی اور وہ سفرنامہ ان کے قلم سے نکلا جو نہ صرف ان کی تحریروں بلکہ اس تعداد کتابوں جو اس موضوع پر لکھی گئی ہیں امتیاز خاص رکھتا ہے، جہاں تک یاد ہے یہ مولانا کی پہلی کتاب تھی جو میں نے بڑے شغف و انہماک کے ساتھ پوری پڑھی، پڑھتا تھا اور مولانا کے زور قلم اور البیلے طرز تحریر پر جس میں ادب اور عارفانہ تعلّی کا نہایت حسین اور دلآویز امتزاج ہے جھوم جھوم جاتا تھا۔ اسی زمانہ کے قریب ندوہ کے ابنائے قدیم (اولڈ بوائز) کا جلسہ ہوا۔ انہوں نے مولانا کو اس جلسہ کا صدر اور حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی کو صدر استقبالیہ منتخب کیا۔ مولانا نے جو علامہ شبلی کے ساتھ خصوصی تعلق اور ندوہ کے مقاصد سے ہم آہنگی بلکہ ندوہ کے تخیل کی علمی تصویر ہونے کی بنا پر اعزازی ندوی تسلیم کئے گئے تھے اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے تو اپنے ایک خطبے میں ان کو باقاعدہ فضلاء ندوہ میں شمار کرکے ان کو بطور سند پیش کیا تھا۔ اس موقع پر جو خطبہ پڑھا اس میں ان کے طرز تحریر کی ساری خوبیاں اس کا پورا بانکپن اور اس کی پوری رنگینی موجود ہے بے ساختہ اور بے تکلف مسجع عبارتیں اور ادبی استعارے اور تشبیہیں قلم سے نکل گئی ہیں حافظہ کی کمزوری کی باوجود اس کا ایک ٹکڑا ابھی تک یاد ہے، بانیان ندوہ اساتذہ دار العلوم اور موجودہ طالب علموں کو بیک وقت خراج محبت پیش کرتے ہوئے ان کے قلم سے یہ جملہ نکلا ہے۔

"اللہ کی رحمت پیران نے نوش پر،
اللہ کی رحمت جوانان نے نوش پر"

ایک فطری ادیب اور صاحب قلم کی پہچان یہ ہے کہ موضوع کیسا ہی سادہ، سنجیدہ اور خشک و پُر تقدس ہو وہ اپنے قلم کی جولانی خیال کی رعنائی اور طرز ادا کی دلآویزی کو روک نہیں سکتا اور اس کے لئے اپنے ادبی ذوق اور اسلوب تحریر سے عاری و خالی ہوجانا ناممکن ہوتا ہے۔ خلافت و ندوہ کے خطبات کا ثقہ و متین ماحول ہو یا فلسفۂ اجتماع یا فلسفۂ جذبات کی سنگلاخ زمین اور پُر خار وادی یا تفسیر و تصوف کا پُر عظمت اور نازک میدان جہاں ہر ہر قدم پر "ہوشیار اور نگاہ روبرو" کی آواز اور بڑے بڑے ادیبوں کے کان میں یہ

قدم سنبھال کے رکھیو یہ تیرا باغ نہیں

کی صدا آتی ہے، اس کا قلم گلکاری اور گلفشانی سے باز نہیں رہتا اور یہی راز ہے کہ ادب و زبان کے رسیا اور لطف بیان کے جویا بھی یہ "بھاری بھرکم" تحریریں ذوق و شوق سے پڑھ لیتے ہیں اور گرانی محسوس نہیں کرتے۔ خالص ادیبوں میں یہ امتیاز مولوی محمد حسین آزاد کا ہے کہ خسرو کی محفل شعر و سخن ہو یا سلطان وقت کا دربار اکبری، ان کی ہر تصویر میں نیرنگ خیال اور ان کی ہر تحریر میں آب حیات نظر آتا ہے۔ عالموں اور محققوں میں مولانا شبلی کی خصوصیت یہ ہے کہ شعر العجم اور موازنۂ انیس و دبیر جیسی خالص ادبی و تنقیدی تصنیف

ہو یا الفاروق و سیرۃ النبی جیسی ثقہ پر شوکت و با عظمت موضوع، یا الکلام و علم الکلام جیسا سنگین و خشک مضمون، ہر جگہ ان کی تحریر کی شگفتگی و رعنائی قائم رہتی ہے اور ادب و زبان کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔ یہی اپنے رنگ میں مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کی خصوصیت ہے کہ ان کی کوئی تحریر ادب و زبان کی چاشنی سے خالی نہیں اور کہیں ان کا اسلوب تحریر جو انکی شخصیت بن گیا ہے ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا، حد یہ ہے کہ لیکی کی کتاب ہسٹری آف یورپین مارلس کے ترجمہ "تاریخ اخلاق یورپ" میں بھی (جو اپنے موضوع، اپنے فنی اصطلاحات، اردو کی تنگ دامنی اور ترجمہ کی وجہ سے نہایت مشکل کام تھا) وہ پورے طور پر کامیاب ہوئے ہیں اور پوری کتاب میں کہیں ثقالت و خشکی اور ترجمہ پن نظر نہیں آیا۔ میرے محدود مطالعہ میں ظفر علی خاں کی "معرکۂ مذہب و سائنس" کے بعد ترجمہ کی کوئی کوشش اتنی کامیاب نظر نہیں آتی، اس بارہ میں ان کے علاوہ اگر کسی کا نام لیا جاسکتا ہے، تو وہ مولوی عنایت اللہ بی۔ اے دہلوی ہیں۔

اب وہ زمانہ آیا کہ میرا ذہن بلوغ کی منزلیں طے کرنے لگا، بڑے بھائی صاحب کی صحبت میں مغربی تہذیب کی سطحیت اور موجودہ تمدن کا کھوکھلا پن نمایاں ہونے لگا۔ اس موقع پر "سچ" کے پرچے جو ندوہ کی طالب علمی اور مولانا سے روز افزوں تعلق کی بنا پر باقاعدگی سے مطالعہ میں آنے لگے تھے، بڑی رہنمائی کرنے لگے اور ان سے ذہن و شعور کو فراوانی کے ساتھ غذا ملنے لگی بلکہ اس اجمال کی تفصیل اور اس خیال کی تکمیل اسی کی رہین منت ہے "سچ" کے مطالعہ نے دو بڑے کام کئے، ایک مغربی تہذیب کی جس کو مولانا یاجوجی تمدن اور دجالی فتنہ سے تعبیر کرتے تھے۔ حقارت اور بے وقعتی اور اس کے ثبوت میں دلائل و واقعات کی فراہمی جو مولانا برطانیہ سے نکلنے والے انگریزی پرچوں سے براہ راست مہیا فرماتے تھے، دوسرے لسان العصر سید اکبر حسین الٰہ آبادی کی شاعری اور ان کے حکیمانہ خیالات سے گہری واقفیت اور قلبی مناسبت! اکبر کے کلام سے مخصوص خاندانی ماحول اور ہم خیالی کی بنا پر مناسبت تو شروع ہی سے تھی لیکن "سچ" نے اس کو عقیدت و محبت کے درجہ تک پہونچا دیا! "سچ" کا کوئی پرچہ مشکل سے ان دونوں باتوں سے خالی ہوتا تھا، مولانا انگلستان و ہندوستان سے نکلنے والوں پرچوں سے ڈھونڈھ کر ایسے حقائق اعداد و شمار، تہذیب مغرب کی ناکامی، اس کی انسانیت کشی اور انسان دشمنی کی مثالیں پیش کرتے رہتے تھے کہ آنکھیں کھل جاتیں اور خون کھول اٹھتا، دوسری طرف حضرت اکبر کے حکیمانہ اشعار کو اپنی دلپذیر تمہید و تشریح کے ساتھ اس طرح پیش کرتے کہ جن باتوں کے لئے ضخیم ضخیم کتابیں لکھی جاسکتی ہیں وہ چٹکیوں میں ادا ہو جاتیں اس طرح "سچ" اس ذہن و شعور کی تشکیل میں بیش قیمت مدد گار رہا جس سے اپنی بعد کی اردو عربی تصنیفات اور ہندوستان اور ہندوستان کے باہر دعوتی کاموں میں بنیادی حصہ رہا یہ وہ احسان ہے جس کو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔

اب وہ وقت آیا کہ مجھے دار العلوم ندوۃ العلماء میں درس قرآن اور تفسیر کی خدمت سپرد ہوئی، مولانا نے اپنی انگریزی تفسیر کی تالیف کا سلسلہ شروع فرما دیا تھا اور اس سلسلہ میں ان کے مطالعہ کا اصل میدان اور تفسیروں میں ان کی تفسیر کا اصل امتیاز صحف سماوی اور مذاہب کا تقابلی مطالعہ اور ان شخصیتوں مقامات اور تاریخی ادوار کی جدید جغرافیائی و تاریخی معلومات کی روشنی میں تحقیق اور قرآن مجید کے مشکل مقامات کا حل پیش کرنا تھا جن کے بارے میں جدید علوم مستشرقین کے اعتراضات اور جدید مطبوعات نے مختلف سوالات کھڑے کر دیئے ہیں میں اپنے درس میں سورہ بقرہ میں ہاروت و ماروت کے قصہ وما کفر سلیمان ولکن الشیاطین کفروا کی آیت پر پہونچا تو مجھے ضرورت محسوس ہوئی کہ مولانا کی تحقیقات و مطالعہ سے استفادہ کروں غالباً سبق روک کر میں پہلی مرتبہ دریاباد اسی مقصد سے گیا۔ مولانا نے قرآن ایک طالب علم کی حیثیت سے بھی اور دیرینہ تعلقات کی بنا پر بھی بڑی شفقت فرمائی اور وہاں سے ایسے بہت سے سوالات کا جواب اور بہت سا قیمتی مواد لے کر آیا، یہ اتفاق غالباً کئی بار پیش آیا کہ مجھے جب کوئی ایسی مشکلات پیش آتیں، تو میں دریاباد کا قصد کرتا یا مولانا کو خط لکھتا، مولانا ہمیشہ جواب شافی سے مدد فرماتے، مولانا کے یہ خطوط جو تقریباً سب میرے پاس محفوظ ہیں، نہ صرف تفسیر کے طالب علموں کے لئے بلکہ عام اہل ذوق کے لئے بھی افادیت رکھتے ہیں۔

اس زمانہ میں حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی نے رسالہ "الندوہ" کا احیاء فرمایا اور اس کی ادارت میں میرے اور رفیق محترم مولانا عبد السلام صاحب قدوائی ندوی (حال ناظم دینیات جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) کے سپرد ہوئی۔ میں نے عام ناظرین کی دلچسپی اور اہل علم کی بینائی کے لئے ایک سلسلہ مضامین "میری محسن کتابیں" کے عنوان سے شروع کیا اور ہندوستان کے مشاہیر اہل علم اور اہل نظر کو موضوع پر قلم اٹھانے کی دعوت دی۔ اس دعوت کی بڑی پذیرائی ہوئی اور قدیم و جدید حلقے کے چوٹی کے اصحاب فکر و نظر نے اس میں حصہ لیا۔ مضمون نگاروں کی پہلی صف میں قدرتاً مولانا عبد الماجد دریابادی بھی تھے، جنہوں نے دعوت قبول کرکے اپنی خورد نوازی اور علم پروری کا ثبوت دیا۔ اس مضمون میں ان کی زندگی کے بہت سے اہم واقعات اور ان کے ذہنی فکری ارتقاء و انقلاب کی مختصر تاریخ آگئی جس سے آئندہ مورخوں اور ادیبوں کو بڑی مدد ملے گی۔

میرے استفادہ اور خط و کتابت کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ غالباً سنہ ۱۹۴۳ء میں مولانا نے اپنے ایک پرچہ میں لندن یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ کے صدر سی۔ ایم جوڈ کی دو کتابوں "ہیر فلاسفی آف اور ٹائمز" اور "اے گائیڈ ٹو ماڈرن وکڈنس" کے اقتباسات پیش کئے، میں اس زمانہ میں کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" لکھ رہا تھا جس کا مختصر اردو ترجمہ پہلے "مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہونچا" پھر اضافوں کے ساتھ دوسرا اڈیشن "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" کے نام سے نکلا، میں نے یہ دونوں کتابیں امیر الدولہ لائبریری سے نکلوائیں اور پوری پڑھ گیا، لیکن ان کے بہت سے مقامات جو خاص اصطلاحات اور تاریخی واقعات اور ادبی تلمیحات پر مبنی تھے، میری سمجھ میں نہیں آئے، میں نے مولانا کو تکلیف دی، اور مولانا نے ان کی پوری تشریح فرمائی، میں نے اپنی کتاب کی تصنیف میں اس کے بہت سے اقتباسات پیش کئے اور ان سے بہت فائدہ اٹھایا۔ کتاب کی تالیف کے دوران میں مجھے ضرورت محسوس ہوئی کہ میں "سچ" اور "صدق" کے پورے فائل پر ایک نظر ڈال لوں کہ ان میں میرے کام کی بہت سی باتیں ہوں گی۔ سخت گرمی کا موسم تھا اور میرے پاس صرف ایک دن تھا۔ مولانا کو اصول و معمول کے مطابق میں اطلاع دے کر ایک دن صبح کی گاڑی سے پہونچا۔ مولانا ایسے موقع پر پسند کرتے ہیں کہ ان کے لائق بھتیجوں میں سے کوئی موجود ہو تاکہ کتابوں کی تلاش کرنا اور مہمان کے کام اور آرام میں ان سے مدد لے اور مولانا کا ہر حیثیت سے خانہ عزیز گرامی محمد ہاشم صاحب قدوائی (حال استاذ سیاسیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) موجود تھے۔ مولانا نے اپنے معمول کے مطابق ضروری انتظامات کر دیئے، کتنا ٹھہروں گا، دوپہر کا کھانا کس وقت کھاؤں گا، پرہیز وغیرہ وغیرہ۔

یہاں پر یہ ذکر بھی کرتا چلوں کہ تھانہ بھون کی سمت ہے جو مولانا کا دوسرا مرکز روحانی اور آخر میں مولانا کی ذہنی اور قلبی عقیدت کا سب سے بڑا مرکز رہ گیا تھا مولانا تھانوی کے خلفاء اور مسترشدین بہت تھے، اور سب ان کے رنگ کے عاشق، لیکن انضباط اوقات اور تنظیم کار کا جیسا نمونہ مولانا کے یہاں دریاباد میں دیکھا مشکل سے کہیں اور پایا اور یہی راز مولانا دریابادی کے اتنے مختلف النوع بلکہ متضاد کاموں کو کامیابی و خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دینے کا ہے، غرض ان سوالات پر میں نے عرض کیا کہ میں صرف آج ٹھہروں گا اور چونکہ وقت بہت کم اور کام بہت ہے دوپہر کا کھانا نہیں کھاؤں گا کہ گرمیوں میں اس کے بعد کام کرنا مشکل ہے باوجود بزرگانہ شفقت کے ایک بار بھی اس پر جرح نہیں فرمائی اور نہ کھانے پر اصرار کیا میں نے کام شروع کیا اور "سچ" کا جب سے اجراء ہوا تھا میں نے اس کے پرچوں پر نظر ڈالی اور اپنے کام کی چیزیں نوٹ کرنی شروع کیں۔ تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ مولانا کے ایک فرستادہ نے گلاس لے کر آئے کہ یہ گرمی کا زمانہ ہے اور کھانے میں داخل نہیں اس میں کوئی حرج نہیں ہوگا، میں نے اس کو بسر و چشم قبول کیا، گھنٹہ دو گھنٹے کے بعد پھر اسی طرح سے لسّی کا گلاس اور پھر کسی وقت شربت آیا اور میں اس حکیمانہ ضیافت و میزبانی کی داد دیتا رہا اور قبول کرتا رہا، واقعہ یہ ہے کہ اگر تفریح و لطیف غذا کی یہ کمک نہ پہنچتی تو شاید یہ کیفیت رہتی تو میں اس شدید گرمی میں مسلسل دماغی کام نہ کرسکتا تھا اور اپنے اس اعلان پر پچھتانا پڑتا کہ میں دن بھر کچھ نہ کھاؤں گا۔ بڑی نورانی، بڑی محنت کوشی گھڑی کا لمبا دن اور کام کی دھن کہ میں نے مغرب تک اپنا کام مکمل کرلیا اور اگلے دن وہاں سے کامیاب آیا۔

اس وقت سے مولانا کی یہ بزرگانہ شفقت اور ان کا عالمانہ ذوق ہے کہ جب کبھی میرے کام کی کوئی چیز ان کی نظر سے گذرتی ہے یا کوئی ایسی کتاب اور مضمون ملاحظہ فرماتے ہیں جو ان کے نزدیک میرے مطالعہ سے گذرنا چاہئے تو وہ کتاب یا مضمون کا تراشہ میرے پاس بھیجدیتے ہیں۔ جب میری دریاباد حاضری ہوتی ہے تو وہ تمام رسائل، مضامین اور کتابیں مہیا فرما لیتے ہیں جن کے متعلق بات چیت کرنی

باقی صفحہ ۳۴ پر

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی

مولانا عبدالماجد دریابادی

★

ولادت بمقام دریاباد ضلع بارہ بنکی (اودھ) ۱۸۹۲ء۔ اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی، عربی حکیم مرزا محمد ذکی صاحب اور مولوی عظمت اللہ صاحب فرنگی محلی سے پڑھی۔ ۱۹۱۲ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔اے پاس کیا۔ فلسفے میں ایم۔اے کرنے علی گڑھ گئے تھے لیکن ایک سال کے بعد تعلیم کا سلسلہ بوجوہ منقطع کرنا پڑا۔ مطالعہ کتب اور لکھنے پڑھنے کا شوق ابتدا ہی سے تھا۔ چنانچہ ۱۹۰۹ء ہی سے وکیل (امرتسر) وغیرہ اس زمانے کے رسائل میں مولانا مختلف ناموں سے لکھتے رہتے تھے بعض چھوٹے چھوٹے رسالے مثلاً "غذائے انسانی" "محمود غزنوی" وغیرہ بھی اسی زمانے میں شائع ہوئے۔ سب سے پہلی قابل ذکر تصنیف "فلسفہ جذبات" ہے جو ۱۹۱۴ء میں انجمن ترقی اردو نے شائع کی تھی۔ اس کے بعد سے تصنیف و تالیف اور مضمون نگاری کا سلسلہ مستقل طور پر جاری ہوگیا۔ ۱۹۱۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے سررشتہ ترجمہ و تالیف میں ملازم ہوگئے تھے۔ لیکن ۱۹۱۹ء میں استعفا دیدیا۔ لکھنؤ میں انگریزی تعلیم کے سلسلے میں فلسفہ سے بے حد شغف رہا تھا۔ جس کے باعث اپنے الحاد اور عقلیت پرستی میں نام پیدا کر لیا تھا حیدرآباد سے واپسی کے بعد ہندو فلسفہ کا شوق پیدا ہوا۔ مسز بیسنٹ، ڈاکٹر بھگوان داس، اربند و گھوش کی تحریروں سے اور گیتا کی تعلیمات سے زیادہ متاثر ہوئے، مادیت سے روحانیت کی طرف آئے۔ روحانیت کی طرف آنا تھا کہ مولانا روم نے انگلی پکڑ لی اور راہ راست پر لگا دیا۔ پھر شبلی کی سیرۃ النبی اور محمد علی لاہوری کے انگریزی ترجمہ قرآن نے اثر کیا، مولانا محمد علی لاہوری کے انگریزی ترجمہ قرآن نے اثر کیا، مولانا محمد علی اور اکبر الٰہ آبادی نے توجہ ڈالی۔ آخر میں مولانا اشرف علی تھانوی نے سالک کو منزل تک پہونچا دیا۔

صحافت سے تعلق روزنامہ "ہمدرد" دہلی سے شروع ہوا۔ ۱۹۲۵ء میں تقریباً ۸ ماہ تک محمد علی کا یہ اخبار مولانا کی نگرانی میں نکلتا رہا۔ ۱۹۲۵ء سے "سچ" ہفتہ وار لکھنؤ سے نکالا۔ "سچ" کے بعد "صدق" اور اب "صدق جدید" (ہفتہ وار) پابندی سے نکل رہا ہے۔ ان کی "سچی باتیں" جو اس پرچہ میں بطور شذرات کے ہوتی ہیں ذکر و فکر دونوں کا لطف دیتی ہیں۔ کل تصانیف کی تعداد پچاس کے قریب ہے جن میں سے خاص خاص یہ ہیں۔

١- فلسفہ جذبات۔ انجمن ترقی اردو (۱۹۱۳ء)
٢- سائیکالوجی آف لیڈرشپ (انگریزی) ۱۹۱۵ء لندن۔
٣- فلسفہ اجتماع۔ انجمن ترقی اردو ۱۹۱۶ء
٤- مکالمات برکلے۔ دارالمصنفین ۱۹۱۹ء
٥- تاریخ اخلاق یورپ ٢ جلدیں۔ انجمن ترقی اردو ۱۹-۱۹۱۸ء۔
٦- منطق (دارالترجمہ حیدرآباد) ۱۹۱۷ء
٧- تاریخ تمدن۔ جلد دوم۔ انجمن ترقی اردو ۱۹۱۹ء
٨- زود پشیماں (ڈراما) الناظر پریس ۱۹۱۶ء، ناظر کے فرضی نام سے۔
٩- فرائض والدین۔ نولکشور ۱۹۲۰ء خادم کے فرضی نام سے۔
١٠- تحفۂ خسروی مطبع نولکشور ۱۹۲۱ء۔
١١- پیام امن۔ مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۲۳ء
١٢- تصوف اسلام " " "
١٣- فیہ ما فیہ (ملفوظات مولانا روم) مطبع معارف
١٤- مبادی فلسفہ، دو حصے مطبع معارف ۱۹۳۱ء
١٥- فلسفیانہ مضامین الناظر بک ایجنسی۔
١٦- فلسفہ اور اس کی تعلیم۔
١٧- مثنوی بحر المحبت (مصحح) مطبع معارف اعظم گڑھ۔
١٨- سفر حجاز مطبع نامی لکھنؤ
١٩- مقالات ماجد۔
٢٠- ہم آپ۔ ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد۔
٢١- ترجمہ و تفسیر ماجدی تاج کمپنی لاہور۔ (انگریزی)
٢٢- تفسیر ماجدی اردو تاج کمپنی لاہور (")
٢٣- اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۵۴ء
٢٤- حکیم الامت، نقوش و تاثرات۔ مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۵۳ء۔
٢٥- محمد علی، ذاتی ڈائری حصہ اول مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۵۴ء۔
٢٦- قصص و مسائل۔
٢٧- ڈھائی ہفتہ پاکستان میں۔
٢٨- جغرافیہ قرآنی یا ارض القرآن۔
٢٩- الحیوانات فی القرآن یا حیوانات قرآنی۔
٣٠- تمدن اسلام کا پیام۔
٣١- تمدن اسلام کی کہانی۔
٣٢- اعلام القرآن یا شخصیت قرآنی۔
٣٣- نورانی چیز
٣٤- نشریات ماجد
٣٥- انشائے ماجد حصہ اول
٣٦- " " حصہ دوم
٣٧- شرح چہل حدیث
٣٨- بشریت انبیاء
٣٩- ترجمہ قرآن انگریزی (بغیر حواشی کے ماڈرن انگریزی میں۔ شائع کردہ تاج کمپنی کراچی)۔

دریاباد لکھنؤ کے مضافات میں سے ہے اور پھر آپ کی پوری جوانی تو لکھنؤ ہی میں بسر ہوئی اس لئے گویا زبان تو یہیں کھلی ہے اور اب بھی جب جی چاہا یا کوئی ضرورت پڑی "حال وارد لکھنؤ" ہوجاتے ہیں۔ اس لئے آپ انھیں دریابادی ثم لکھنوی نہایت آسانی سے کہہ سکتے ہیں۔

مولانا کو پہچاننا بہت آسان ہے، چہرہ بیضوی، کھلتا ہوا رنگ جو اب گندمی ہونے پر مائل ہے، کھدر کا لمبا کرتا اُس پر عبا، کھدر کی گاندھی ٹوپی جسکی چوڑائی معمول سے زیادہ رہتی ہے، پاجامہ شرعی، متوسط قد، داڑھی میں صبح و شام کی آمیزش، خاموش رہیں تو بزرگ فرشتہ معلوم ہوتے ہیں، بولیں تو منہ سے گویا پھول جھڑتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے فقرے، گُترے گُترے جملے، لیکن جامع مانع جیسے سعدی کی گلستاں طبیعت میں مزاح بھی ہے اور اس سے زیادہ طنز بھی اور آپ جانتے ہیں کہ جب کوئی لکھنؤ والا طنز و مزاح پر اُترتا ہے تو رعایت لفظی یا ضلع جگت سے چند لفظوں اور فقروں میں کیا کیا گلکاریاں نہیں کر جاتا۔ یہی خصوصیت مولانا کی ہے جسے آپ اُنکی تحریر اور تقریر میں اکثر پائیں گے۔ یہ رعایت لفظی بعض جگہ تو بہت معمولی ہوکر حسن نظامی کی سطح پر آجاتی ہے۔ لیکن زیادہ تر دور کی کوڑی لاتی ہے۔ شدت احساس اور شدت جذبات مولانا کی طبیعت اور تحریر دونوں میں نمایاں ہے۔ محبت و نفرت پسند اور ناپسند دونوں میں شدت، محبت بڑھ کر عشق و عقیدت اور پرستاری کی حدوں کو چھونے لگتی ہے اور نفرت کراہت میں تبدیل ہو جاتی ہے، عقل سلیم اور صدق طلب ایسے جذباتی بزرگوں کی رہنمائی نہ کرے تو ان کا بھٹک جانا یا اُن کو بھٹکا دینا مشکل امر نہیں ہوتا، مولانا بحمد اللہ اب ان تمام منزلوں سے گزر کر اب راہ مستقیم پر بڑی استقامت کیساتھ گامزن ہیں بلکہ اب دوسروں کو راہ بتاتے ہیں اور بتانے کے لئے تیار رہتے ہیں نوجوان طبقہ اور نوجوان ادیب ان سے محبت اور عقیدت بھی رکھتے ہیں۔ مخالف بھی رہتے ہیں اس لئے کہ مولانا کی زبان اور قلم کسی کی غلطی کو بخشتا نہیں ہے۔ لیکن مولانا نوجوانوں پر شفقت اور ہمت افزائی کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں بشرطیکہ وہ ان سے رجوع ہوں۔ بڑی خصوصیت مولانا کی جرأت و ہمت ہے وہ کسی سے ڈرتے نہیں ہیں چاہے وہ کسی کی بڑی شخصیت ہو یا کوئی بڑی حکومت صاف صاف کہنے کا موقع نہ ہوا تو طنز و طعن ہی سے کلیجہ چھلنی کردیں گے۔

مولانا موصوف کے ادبی و مذہبی صحافتی اور علمی کارناموں کے متعلق تفصیل سے لکھنا دقت طلب بھی ہے اور وقت طلب بھی۔ دقت یہ کہ وہی شخص ان کے گوناگوں کمالات پر قدم اُٹھا سکتا ہے جو خود تقریباً اتنا ہی صاحب کمال ہو اور وقت طلب یوں کہ مولانا موصوف کی انشاء پردازی ۶۰ سال سے زیادہ مدت پر محیط ہے۔ چند ہفتوں یا مہینوں میں انکے کمالات کا احاطہ کر لینا محالات میں سے ہے پھر ان کی ذات اور شخصیت کے متعلق بھی اعتماد کے ساتھ وہی شخص قلم اُٹھا سکتا ہے جسے مولانا کا فیضان صحبت کافی عرصہ تک حاصل رہا ہو۔

مولانا نے جب سے ہوش سنبھالا اُن کے زمانے میں شبلی، اکبر الٰہ آبادی کا ادبی دنیا میں طوطی بول رہا تھا۔ مولانا محمد علی اپنی تقریروں اور تحریروں کے باعث سیاسی بساط پر چھائے ہوئے تھے۔ بزم مسلموں میں بھی ایک سے ایک عالم و فاضل، فلسفی، مدبر اور سیاست داں موجود تھا (جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے) معاصرین میں ابوالکلام آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالباری ندوی جیسے جید عالم تھے۔ صحافیوں میں ظفر الملک، مولانا محمد علی، جالب مرحوم، نیاز فتحپوری جیسے اکابر تھے۔ ان میں سے بہتوں سے مولانا موصوف کے گہرے تعلقات تھے اور اُن سے برابر خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔ چنانچہ اکبر الٰہ آبادی، مولانا سید سلیمان ندوی کے مکاتیب اور مولانا محمد علی و مولانا اشرف علی تھانوی کے متعلق انہوں نے جو اپنے تاثرات شائع کرائے ہیں اُن سے نہ صرف ان بزرگوں کی سیرت و شخصیت کے پہلو اُجاگر ہوتے ہیں۔ بلکہ اس عہد کی علمی و تہذیبی زندگی پر بھی پوری روشنی پڑتی ہے کہیں کہیں سیاست کی ہواؤں کے رُخ بھی نظر آجاتے ہیں اسلئے یہ خطوط تاریخی اہمیت کے حامل بھی کہے جاسکتے ہیں خیال ہے کہ نیاز فتحپوری کے جو مولانا کے مخالفین میں سے تھے اور جوش ملیح آبادی کے جو طبعاً مسلک رندی کے پیرو ہیں مولانا کے

پاس ضرور خطوط موجود ہوں گے اگر یہ خطوط بھی شائع ہوسکیں تو شاید گلشن ادب میں کچھ شوخ رنگ اور تیز بو والے پھولوں کی نمائش بھی دیکھنے میں آسکے۔

مولانا کی تصانیف پر ایک سرسری نظر ڈالنے ہی سے معلوم ہوجاتا ہے کہ مولانا کی شیفتگی ایک طرف تو مذہبیات سے ہے اور دوسری طرف ادبیات سے۔ مذہبی خدمات میں سب سے افضل آپ کا وہ ترجمہ و تفسیر قرآن پاک ہے جو تفسیر ماجدی کے نام سے شائع ہو رہا ہے اس کے دوسرے اڈیشن کی دو جلدیں (اٹھارہ پارے تک) ابھی تک منظر عام پر آسکی ہیں۔ قرآن پاک کے ترجمے بہت سے حضرات نے کئے لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ اسی وقت قابل قدر ہو سکتا ہے جب مترجم دونوں زبانوں کا ماہر اور ان کے صرفی و نحوی نکات پر اسے عبور کامل ہو۔ اردو ایک کم عمر زبان ہے۔ ہر پچیس، تیس سال کے بعد اس کے محاورات و روزمرہ میں موجودہ روز افزوں علمی و ادبی ترقیوں کے باعث نمایاں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں مولانا موصوف اردو زبان (خصوصاً مستند لکھنوی دبستان کی) کے ماہر کامل ہیں اور اس کی نوک پلک سے بخوبی واقف ہے اس لئے باوصف اس کے کہ قرآن پاک کے کئی اچھے اچھے ترجمے ماضی قریب و بعید میں ہو چکے ہیں لیکن تفسیر ماجدی زبان اور بیان کے اعتبار سے اُن تمام کاوشوں کی فی زمانہ آخر ترقی یافتہ شکل رکھی جاسکتی ہے۔

ادبیات میں مولانا کی دلچسپی تنقید سے زیادہ رہی ہے ویسے جوانی میں کچھ شعر و شاعری بھی کی ہے ایک ڈراما بھی لکھا ہے۔ لیکن جلد ہی تخلیقات سے انتقادیات کی طرف آگئے اور تنقید میں بھی بیشتر آپ کا انداز تقریظی یا تعریفی ہوتا ہے اور اس میں تفصیل کے بجائے کوشش اس کی رہتی ہے کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مفاہیم آجائیں بعض اوقات بعض ادبی کارناموں کی شوخ اور رنگین عبارتوں کی بھی اس انداز میں تعریف کی ہے کہ خود مولانا کے اندر رند اسیر، اپنی وہ زنجیریں توڑتا نظر آنے لگتا ہے جو محتسب مذہبی نے اس کے گرد لپیٹ رکھی ہیں۔

علمی شوق موصوف کو ہمیشہ رہا اور بحمد اللہ آج تک ویسا ہی ہے۔ صرف فلسفہ منطق وغیرہ علوم ہی نہیں جو ابتدا میں انھیں شدت سے مرغوب تھے۔ جدید علوم سے بھی واقف رہنے کی سعی رہتی ہے۔ نئی نئی زبانیں مثلاً عبرانی جرمن وغیرہ سیکھنے کا بھی شوق ہے ہر چند کہ ابھی دو سال ہوئے مولانا کی رفیقہ حیات کی دائمی جدائی نے ان کی دلچسپی خود زندگی سے بہت کم کردی ہے لیکن اُن کی پابندی اوقات (جس پر مولانا شدت سے عامل ہیں) اور علمی شغف اس صدمہ جانکاہ کو وقتی طور پر بہلائے رکھتا ہے اور پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ مولانا تحقیق علمی میں کسی بات پر ضد کے ساتھ قائم رہیں ایسا نہیں ہے وہ مخالفین کی بات کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں خواہ مخالفت مذہبی مسالک میں ہو یا ادبی امور میں۔ اگرچہ مذہبی اور خصوصاً فقہی مسائل میں وہ کسی اجتہاد کی ذمہ داری اپنے اوپر لینے کو کبھی تیار نہ ہوں گے لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ کسی بدعت کو برداشت نہیں کر سکتے اور آجکل جبکہ مختلف تہذیبی اور سیاسی اثرات کے تحت کئی مذہبی اور نیم مذہبی سر اُٹھانے کو تیار رہتی ہیں۔ مولانا کا قلم ایسے مواقع پر محتسب کے فرائض انجام دینے لگتا ہے اور آجکل کے ہندوستان میں جبکہ ملت اسلامی کے گمراہ ہوجانے کے بہت سے خطرات درپیش ہیں مولانا کا وجود بسا غنیمت معلوم ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر مولانا آدمی بڑے ہی محبت والے ہیں کوئی آپ کی طرف ایک قدم بڑھے تو آپ دس قدم بڑھنے کو تیار، آج کل کی روز افزوں مادہ اور مطلب پرستی کی دنیا میں ایسے پابند اوقات اور ایسے صدق باصفا رکھنے والے بزرگ عنقا ہوتے جارہے ہیں۔ خدا موصوف کو عرصہ دراز تک زندہ و سلامت رکھے! ان کی حیات کے پہلو اتنے گوناگوں ہیں کہ "فروغ اردو" کے چند مختصر قسم کے صفحات میں ان کی سمائی ناممکن ہے۔

منی آرڈر کوپن پر پتہ صاف اور
خوشخط تحریر کریں۔

نمایاں شخصیت

از:- (سعید احمد اکبرآبادی)

افسوس ہے بہت دنوں سے جس کا کھٹکا لگا ہوا تھا آخر وہ دن بھی آگیا یعنی مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے کم و بیش ۸۵ برس کی عمر میں ایک طویل علالت کے بعد ۶ جنوری ۱۹۷۷ء کو اپنے وطن دریاباد میں وفات پائی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مولانا اپنی خصوصیات اور کمالات و اوصاف کے باعث ایک خاص اور نمایاں شخصیت کے مالک تھے، برصغیر ہند و پاک کے علمی اور ادبی اور اسلامی حلقے اُن کو اپنا بزرگ مانتے اور اس لئے اُن کا بڑا ادب و احترام کرتے تھے۔ مولانا کی اصل تعلیم انگریزی کی تھی، فلسفہ اور نفسیات اُن کے خاص مضمون تھے۔ لکھنؤ سے بی۔اے پاس کیا تھا۔ اس کے بعد کچھ دنوں علی گڑھ میں بھی رہے، لیکن ایم۔اے نہ کرسکے، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ بی۔اے کی قدر آج کل کے پی۔ایچ۔ڈی سے بھی زیادہ ہوتی تھی اور وہ درحقیقت ان سے زیادہ قابل اور لائق بھی ہوتا۔ مولانا نے باقاعدہ کبھی اور کہیں ملازمت نہیں کی، تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ دنوں دارالترجمہ حیدرآباد سے منسلک رہے اور منطق و فلسفہ کی بعض کتابوں کو انگریزی سے اُردو میں منتقل کیا، مگر وہاں جی نہ لگا اور وطن چلے آئے، یہاں آکر ایسے جمے کہ بڑے بڑے انقلابات آئے، زمین اور آسمان زیر و زبر ہوگئے، مگر مولانا اپنے قصباتی کنج عافیت سے نہ نکلے اور ساری عمر وہیں گزار دی۔

مولانا کی تصنیفی زندگی کا آغاز ایک فلسفی اور اردو شعر و ادب کے ایک نقاد کی حیثیت سے ہوا، مطالعہ کے دھنی اور رسا نظر میں وسعت اور ذہانت و فطانت خدا داد، اس زمانہ کے باکمال ارباب قلم کی صحبت، پھر سب سے بڑی بات یہ کہ انشاء و تحریر کا ایک منفرد اسلوب، ان سب چیزوں نے مل جل کر عنفوان شباب میں ہی اردو زبان کا ایک ممتاز ادیب اور مصنف بنا دیا۔ مولانا نے تذکرہ و سوانح، شعر و ادب، تاریخ و فلسفہ اور اجتماعی مسائل، ان سب پر بہت کچھ لکھا اور اچھے سے اچھا لکھا لیکن آپکا سب سے بڑا کارنامہ، جو بقائے دوام کا ضامن ہے وہ انگریزی اور اُردو میں ترجمہ و تفسیر کلام مجید ہے۔ ابھی عمر کی درمیانی منزل میں ہی تھے کہ آپ کو اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی کے فیض صحبت و اثر سے قرآن مجید کے ساتھ ایسا شغف و انہماک پیدا ہوا کہ زندگی اس کی خدمت کے لئے وقف کردی، اگرچہ وہ دوسرے کام بھی کرتے رہے لیکن ان کی حیثیت ضمنی تھی۔ ترجمہ و تفسیر کے سلسلہ میں مولانا نے مسلسل سالہا سال جو محنت شاقہ برداشت کی ہے اور جس ذوق و شوق اور انہماک سے یہ عظیم الشان خدمت انجام دی ہے اُس کا اندازہ کتاب دیکھنے سے ہی ہوسکتا ہے۔ اس ذیل میں مولانا نے عربی اور اُردو زبان کی تفاسیر، اور عربی و قرآنی لغات کا مطالعہ تو محنت اور وسعت سے کیا ہی تھا سب سے بڑی بات یہ ہے کہ چونکہ قرآن مجید میں اہل کتاب اور ان کی کتابوں کا تذکرہ کثرت سے ہے پھر امم قدیمہ کے حالات و سوانح بھی جگہ جگہ بیان کئے گئے ہیں اس بنا پر مولانا نے کتب قدیمہ یعنی اور NEW TESTAMENT کے پرانے اور نئے اڈیشن اور امم سابقہ کی تاریخ پر بہت مستند اور محققانہ کتابوں کا وہ عظیم ذخیرہ بڑی محنت اور دل کی لگن کے ساتھ کہاں کہاں سے فراہم کیا، اس سلسلہ میں عبرانی زبان بھی سیکھی، پھر قرآن مجید سے متعلق جو کچھ یورپ میں لکھا گیا تھا اس کی کتابیں بھی برابر بہم پہونچاتے اور بڑے غور و خوض سے اُن کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ علاوہ ازیں فلسفہ اور سائنس کے نئے نئے نظریات و افکار سے بھی واقف رہتے تھے۔ ان سب چیزوں سے انہوں نے اپنی تفسیر میں کام لیا اور یہی چیز مولانا کی تفسیر کی وہ انفرادی خصوصیت بن گئی جس میں کوئی ان کا سہیم و شریک نہیں ہے، تفسیر ماجدی کے بعد جن حضرات نے قرآن مجید کی تفسیر یا اس کی تفہیم کے سلسلہ میں ان موضوعات پر لکھا ہے اُس میں انہوں نے درحقیقت مولانا کی ہی خوشہ چینی کی ہے، مولانا کے خامۂ زر نگار سے جو مضمون نکل گیا سدا بہار ہوگیا۔ لیکن علمی، تحقیقی اور ادبی حیثیت سے تفسیر ماجدی مولانا کا وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جس کی آب و تاب وقت گزرنے کے ساتھ اور بڑھے گی اور آئندہ نسلیں شکر گزاری کے ساتھ انہیں یاد کریں گی۔

حکیم عبد القوی دریابادی

مولانا عبد الماجد دریابادی

کی

مکمّل فہرست تصانیف

مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کی تصانیف وتراجم کی مکمل فہرست حسب ذیل ہے۔ اس میں بعض ان کے ایسے مضامین یا مجموعہائے مضامین بھی شامل ہیں جو دوسرے ناشروں یا اداروں نے اپنے طور سے شائع کئے ہیں اور جنھیں مولانا ان کی اشاعت کے بعد ہی پہلی بار دیکھ سکے تھے اس لئے ان کی تدوین و ترتیب میں وہ کوئی حصہ نہیں لے سکے تھے۔ ان کی سب سے پہلی تصانیف ان کے دو مضامین ہیں جو اس نے ان کے عہد طالب علمی (اس زمانہ میں وہ ایف اے کے طالب علم تھے) میں اس وقت کے کثیر الاشاعت اردو روزنامہ "وکیل" امرتسر میں نکلے تھے اور اس اخبار کے ادارہ نے انھیں چھوٹے سائز پر کتابی شکل میں شائع کیا تھا اور پہلے پہل اس ادارہ نے ان کتابوں کے سرورق پر ان کے نام کے ساتھ مولانا کا لفظ ایزاد کیا تھا۔

(۱) غذائے انسانی: (اس رسالہ میں آریہ سماجیوں وغیرہ کے اعتراضات گوشت خوری کا مدلل جواب دے کر گوشت خوری کو مطابق فطرت انسانی ثابت کیا ہے)۔

(۲) محمود غزنوی: (سلطان محمود غزنوی پر کئے جانے والے متعصبانہ تاریخی اعتراضات کا مدلل جواب)۔

فلسفیانہ کتابیں:

اوّلاً انہوں نے ایک ایسے فلسفی مصنف کی حیثیت سے شہرت حاصل کی جس نے فلسفہ جدید خصوصًا اسکی شاخ نفسیات کے مضامین کو اُردو میں انتہائی انشاپردازانہ رنگ میں منتقل کیا۔ اسی سلسلہ کی۔

(۳) کتاب "فلسفہ جذبات" سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ اسے انجمن ترقی اُردو (ہند) نے شائع کیا تھا۔ اس کے تین اڈیشن نکلے۔

(۴) "فلسفہ اجتماع": اس کتاب کو اس کے بعض الحادی اجزا کے باعث مولانا نے جب ان کا دورِ الحاد ختم ہوا اور وہ اسلام کے زبردست مبلغ بن گئے تو اپنی تصانیف کے زمرہ سے خارج کردیا۔ یہ کتاب بھی انجمن ترقی اُردو کے زیر اہتمام چھپی تھی۔

(۵) "سائکالوجی آف لیڈرشپ" یہ کتاب کم و بیش انھیں مضامین پر مشتمل تھی جو اُردو و عربی فلسفہ اجتماع کے تھے۔ اسے انگلستان کے مشہور ناشر کتب فشران (لندن) نے اس زمانہ میں شائع کیا جب کہ مولانا بہت نوعمر تھے۔

(۶) "مکالمات برکلے"۔ (مشہور یوروپین فلسفی برکلے کے ڈائیلاگس کا ترجمہ شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڈھ۔

(۷) "فلسفیانہ مضامین" مولانا کے ان فلسفیانہ مضامین کا مجموعہ جو رسالہ "الناظر" لکھنؤ میں وقتًا فوقتًا شائع ہوئے تھے۔ شائع کردہ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ۔ کتابی شکل میں ان کی تدوین رسالہ کے اڈیٹر مولوی ظفر الملک مرحوم نے کی ہے خود مولانا نے اپنے فلسفیانہ مضامین کا مجموعہ۔

(۸) پُرانے شائع شدہ مضامین پر مکمل نظر ثانی کے بعد . . .

(۹) دار المصنفین اعظم گڈھ سے مبادی فلسفہ۔ فلسفہ کی پہلی کتاب اور مبادی فلسفہ حصہ دوم یا فلسفہ کی دوسری کتاب کے عنوان سے اول الذکر مجموعہ کی اشاعت چند سال بعد کرائے۔ ان میں الناظر والے مضامین کے علاوہ وہ فلسفیانہ مضامین بھی شامل ہیں جو رسالہ ادیب الہ آباد، رسالہ معارف اعظم گڈھ وغیرہ میں نکلے تھے۔

(۱۰) "فلسفہ اور اس کی تعلیم" مولانا کا ایک مضمون جو پہلے رسالہ الناظر (لکھنؤ) میں نکلا تھا۔ اسے الناظر بک ایجنسی نے کتابی شکل میں بھی شائع کیا تھا۔

(۱۱) "ہم آپ" (پاپولر سائکالوجی پر مولانا کی آخری تصنیف جو ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد کے زیر اہتمام شائع ہوئی)۔

(۱۲) "منطق" (یہ کتاب عثمانیہ یونیورسٹی میں داخل نصاب رہی تھی اور سررشتہ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ کے زیر اہتمام شائع ہوئی تھی۔

تراجم:

(۱۳، ۱۴) "تاریخ اخلاق یورپ" مشہور مؤرخ لیکی کی مشہور کتاب ہسٹری آف دی یوروپین مارلس کا ترجمہ دو جلدوں میں۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔

(۱۵) "تاریخ تمدن، حصہ دوم" بکل کی انگریزی کتاب کا ترجمہ منشی احمد علی کاکوروی، انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام کر رہے تھے، حصہ اول مکمل کر چکے تھے، حصہ دوم کا ترجمہ ناتمام تھا کہ انکا پیام اجل آگیا۔ دوسرے حصہ کے بقیہ بڑے حصہ کا ترجمہ مولانا عبد الماجد نے مکمل کیا۔

(۱۶) "تاریخ یورپ" (سررشتہ تالیف و ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کی شائع کردہ اس ضخیم کتاب کے بعض اجزاء کا ترجمہ مولانا عبد الماجد نے کیا تھا)۔

(۱۷) "پیام امن" ایک فلسفی مصنف وامن پسند فلسفی میبو پال رچرڈ کی کتاب کا جو پہلی جنگ عالمگیر کے بعد جنگ کے خلاف اور اس کی تباہ کاریوں سے دنیا کو خبردار کرنے کے لئے لکھی گئی تھی، کا اُردو ترجمہ۔ اس میں مترجم نے اسلام اور امن وغیرہ کے عنوان سے چند نئے ابواب کا اضافہ بھی کیا تھا۔

تصوّف:

(۱۸) "تصوف اسلام" مولانا کی مقبول ترین کتاب اس کے پانچ اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اسلامی تصوف کی مختصر لیکن جامع تاریخ کی حیثیت رکھتی ہے۔

(۱۹) فیہ مافیہ (فارسی) ملفوظات مولانا روم۔ یہ کتاب نایاب تھی متعدد قلمی نسخوں سے مقابلہ و تصحیح کے بعد مع ایک پُرمعلومات مقدمہ کے مولانا نے اسے شائع کیا۔ شائع کردہ دار المصنفین۔

سفرنامے:

(۲۰) "سفر حجاز" ۱۹۲۹ء میں مولانا نے سفر حج کیا تھا۔ اس کی دلکش روداد اوّلاً ان کے ہفتہ وار سچ لکھنؤ میں بالاقساط چھپی۔ پھر وہ کتابی شکل میں شائع ہو کر بہت مقبول ہوئی۔ اس کے تین اڈیشن نکل چکے ہیں۔

(۲۱) ڈھائی ہفتہ پاکستان میں"۔ مولانا نے گورنر جنرل پاکستان ملک غلام محمد مرحوم کی دعوت پر ۱۹۵۵ء میں لاہور و کراچی کا سفر کیا تھا۔ یہ روداد سفر اوّلاً مولانا کے ہفتہ وار صدق جدید میں نکلی اور بعد ازاں کتابی شکل میں۔

ادبی تصانیف:

(۲۲) "زود پشیماں" ایک ڈرامہ جو مولانا نے "ناظر" کے فرضی نام سے لکھا تھا اب ان کی فہرست تصانیف سے خارج سمجھا چاہیئے۔

(۲۳) "مثنوی بحر المحبت" اُردو کے مشہور شاعر شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی ایک نایاب مثنوی کو مولانا نے ایڈٹ کر کے شائع کیا تھا۔ شائع کردہ دار المصنفین۔

(۲۴) مقالات ماجد" مولانا کے ادبی مضامین کا مجموعہ جو تاج آفس بمبئی نے شائع کیا اس کو نظر ثانی کے بعد۔

(۲۵) انشاء ماجد حصہ اول

(۲۶) " حصہ دوم کو نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا۔ (اسکا ایک اڈیشن پاکستان سے بھی عشرت بک ڈپو نے شائع کیا تھا)

(۲۷) "نشریات ماجد حصہ اول"۔ مولانا کی نشری تقاریر کا دلپذیر مجموعہ۔

(۲۸) مضامین عبد الماجد۔ اس میں ادبی و مذہبی دونوں قسم کے وہ مضامین شامل ہیں جو مولانا کے اخبارات "سچ" و "صدق" میں نکلے تھے۔ اسے حیدرآباد کے ادارہ اشاعت اُردو نے شائع کیا تھا، اور اسکی ترتیب مولوی ڈاکٹر غلام دستگیر رشید حیدرآبادی نے کی تھی۔

(۲۹) اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں"۔ لسان العصر حضرت اکبر سے مولانا کو ہمیشہ خصوصی تعلق رہا ہے۔ انہوں نے اکبر پر متعدد بڑے اور چھوٹے مضامین پیام اکبر۔ نیا آئین اکبری وغیرہ کے عنوانات سے لکھے تھے۔ ان اکبری مضامین کا یہ مکمل مجموعہ انوار بک ڈپو (لکھنؤ) ادارۂ فروغ اردو نے شائع کیا۔

(۳۰) مکاتیب اکبر۔ اکبر الہ آبادی کی وفات کے بعد ان کے خطوط بنام مولانا عبد الماجد دریابادی کا مجموعہ خواجہ حسن نظامی دہلوی نے شائع کرایا تھا اس پر مولانا عبد الماجد نے توضیحی حواشی لکھے تھے۔

(۳۱) خطوط مشاہیر حصہ اول۔ اس میں مولانا کے علامہ شبلی نعمانی کے خطوط (شبلی نامہ) اکبر الہ آبادی کے خطوط (اکبر نامہ) اور رئیس الاحرار

مولانا محمد جوہر کے خطوط (جوہر نامہ) مع مولانا کے حواشی اور علیحدہ علیحدہ دیباچوں کے درج ہیں۔ اس کا پہلا اڈیشن تاج کمپنی کراچی و لاہور نے شائع کیا تھا۔ دوسرا اڈیشن حال میں نظر ثانی اور جدید حواشی و دیباچوں کے ساتھ نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا۔

(۳۲ و ۳۳) "مکتوبات سلیمانی" حصہ اول وحصہ دوم یعنی مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے مکتوبات مولانا دریابادی کے نام جنہیں مولانا نے بکثرت حواشی دیکر ان کی افادیت بڑھادی ہے۔ دونوں کے شروع میں ایک مفصل دیباچہ بھی۔ شائع کردہ صدق جدید بک ایجنسی۔

تفسیر قرآن ومتعلقات تفسیر:

(۳۴) تفسیر ماجدی انگریزی۔ مولانا کا یہ معرکۃ الآراء انگریزی ترجمہ و تفسیر جو ان کی سالہا سال کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے، تاج کمپنی کراچی و لاہور کے زیر اہتمام سات منزلوں میں الگ الگ بھی چھپا اور دو حصوں میں پندرہ پندرہ پاروں کے دو حصّوں میں بھی۔ ترجمہ کی زبان بائبل والی قدیم انگریزی ہے لیکن حواشی ماڈرن انگریزی میں ہیں۔

(۳۴) ترجمہ قرآن انگریزی بلا حواشی تاج کمپنی کی فرمائش پر مولانا نے یہ ترجمہ دو ڈھائی سال قبل بجائے بائبل کی انگریزی زبان کے جدید و مروّج انگریزی میں کیا ہے۔

(۳۵) تفسیر ماجدی۔ ضخیم اردو تفسیر تاج کمپنی نے سات منزلوں میں شائع کی اور علیحدہ علیحدہ دو حصّوں میں بھی اور مکمل ایک جلد میں بھی۔

(۳۶) تفسیر کا دوسرا اڈیشن مولانا کی مکمل نظر ثانی اور بہت کچھ ترمیم و اضافہ کے (اور اس کے نتیجہ میں پہلے اور دوسرے اڈیشن میں بہت فرق ہوگیا ہے) صدق جدید بک ایجنسی کے زیر اہتمام شائع ہو رہا ہے۔

پہلی جلد: یہ سورۂ فاتحہ سے ختم سورۂ آل عمران تک ہے۔ دوسری جلد جو دسویں پارہ کے ختم تک ہے۔ ابھی تین ماہ ہوئے شائع ہوئی ہے اس کی ضخامت ۸ سو صفحات سے زائد ہے۔

(۳۷) جغرافیۂ قرآنی یا ارض القرآن۔ قرآن میں جن مقامات کے نام اور اشارے ہیں ان کے متعلق ضروری معلومات بہ ترتیب حروف ہجی شائع کردہ صدق جدید بک ایجنسی۔

(۳۸) حیوانات قرآنی یا الحیوانات فی القرآن ۔ قرآن میں جن حیوانات کا ذکر آیا ہے ان کے اور ان کے متعلقات مثلاً گوشت دودھ جلد ناخن وغیرہ سے متعلق ذخیرۂ معلومات بہ ترتیب حروف تہجی۔

(۳۹) شخصیات قرآنی یا اعلام القرآن قرآن پاک میں جو اسماء آئے ہیں یا جن کا اشارہ ملتا ہے اُن سے متعلق معلومات بہ ترتیب لغات۔

(۴۰) جدید قصص الانبیاء کے دو باب مولانا کا لکچر اسلامیہ کالج پشاور میں ہوا تھا اور وہاں سے ایک رسالہ کی شکل میں شائع ہوا تھا بعد میں،

(۴۱) یہی مضمون مع ایک اور مضمون کے قدیم علم کلام کے مسائل جدید روشنی میں جو رضا اکاڈمی رام پور میں پڑھا گیا تھا۔ قصص و مسائل کے نام سے اوّلاً نفیس اکاڈمی حیدرآباد نے اور پھر صدق جدید بک ایجنسی لکھنؤ نے شائع کیا۔

(۴۲) بشریت انبیاء۔ یہ کتاب بھی تمام تر آیات قرآنی ہی سے مستفاد و ماخوذ ہے اور اپنے موضوع پر بالکل منفرد۔ شائع کردہ صدق جدید بک ایجنسی لکھنؤ۔

(۴۳) خطبات ماجدی یا سیرۃ نبوی قرآنی۔ مولانا کے ان لکچروں کا مجموعہ جو انھوں نے اس موضوع پر مدراس میں دیئے تھے۔ یہ کتاب خطبات ماجدی کے نام سے صدق جدید بک ایجنسی نے شائع کی ہے اور یہی کتاب چھوٹی تقطیع پر سیرت نبوی قرآنی کے نام سے مدراس کی ایک انجمن نے شائع کی ہے۔ اول الذکر میں ایک دیباچہ اور اختتامیہ کا اضافہ ہے۔

حدیث وادعیہ:

(۴۴) ترجمہ و شرح مناجات مقبول تھانوی۔ مولانا اشرف علی تھانوی کی مرتب کردہ مناجات مقبول کی شرح۔ اس کے تین اڈیشن چھپ چکے ہیں۔

(۴۵) شرح چہل حدیث ولی اللّٰہی۔ تقطیع جیبی۔ شائع کردہ صدق جدید بک ایجنسی۔

سوانح:

(۴۶) حکیم الامت نقوش وتاثرات، مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم کی ضخیم سوانح، ان کی زندگی کے آخری اٹھارہ سال کے احوال پر مشتمل اوّلاً اس کے اجزاء اخبار صدق میں قسط وار نکلے۔ بعد میں کتابی شکل میں دار المصنفین اعظم گڈھ سے شائع ہوئی۔ دوسرا اڈیشن لاہور سے شائع ہوا۔

(۴۷) محمد علی۔ سلسلہ مضامین اخبار سچ لکھنؤ میں نکلنا شروع ہوا تھا لیکن مکمل نہیں ہوا تھا۔ اس نامکمل سلسلہ مضامین کو ادارۂ اشاعت اُردو حیدرآباد نے محمد علی کے نام سے شائع کیا تھا۔ بعد میں

(۴۸، ۴۹) اسی کتاب کو مکمل کر کے مولانا نے محمد علی ذاتی ڈائری کے نام سے دو حصّوں میں شائع کیا۔ دار المصنفین اعظم گڈھ میں اس کی اشاعت عمل میں آئی۔

مجموعۂ مضامین:

(۵۰) مُردوں کی مسیحائی۔ مولانا کے وہ مضامین جو سیرت نبویؐ کے مختلف پہلوؤں پر "سچ" لکھنؤ میں نکلے تھے۔ ان کا مجموعہ شائع کردہ ادارۂ اشاعت اُردو حیدرآباد۔

(۵۱) سچی باتیں۔ اخبار سچ و صدق میں نکلنے والی سچی باتیں، کا مجموعہ مرتبہ حکیم محی الدین ہلال (تلنگانہ دکن)

(۵۲) صاحب رسولؐ۔ مولانا کا ایک سیرتی مضمون جو حیدرآباد کی کسی انجمن نے شائع کیا

(۵۳) یتیم کی جیت

(۵۴) یتیم کا راج

مولانا کے دو سیرتی مضامین جو تحریک سیرت (ضلع لاہور) کے ناظم قاضی عبد المجید قریشی مرحوم نے رسالوں کی شکل میں شائع کئے۔

(۵۵) تمدن اسلام کا پیام بیسویں صدی کے نام۔

(۵۶) تمدن اسلام کی کہانی۔ مولانا کے دو لکچر جو انجمن اسلامی تمدن مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے دو مختلف جلسوں میں پڑھے گئے۔

متفرق:

(۵۷) تحفۂ خسروی۔ راعی ورعایا کے تعلقات سے متعلق فارسی کتب اخلاق سے ماخوذ۔ شائع کردہ اودھ بک ایجنسی لکھنؤ۔

(۵۸) فرائض والدین۔ خادم تعلیم کے فرضی نام سے۔ شائع کردہ نولکشور بک ڈپو لکھنؤ

(۵۹) مشاہیر سائنس۔ میکملن کمپنی کلکتہ کی شائع کردہ انگریزی سے ترجمہ۔

(۶۰) مولانا کے تازہ قرآنی لکچر مشکلات القرآن یا قرآن کا مطالعہ بیسویں صدی میں ان سطور کی تحریر کے وقت مدراس میں زیر طبع ہیں۔

(۶۱) خطبۂ صدارت استقبالیہ آل انڈیا خلافت کانفرس اجلاس لکھنؤ ۱۹۲۷ء۔

(۶۲) نورانی جنتری۔ مرتبہ مولوی محی الدین منیری اس میں مولانا کا تحریر کردہ خطبہ نکاح شامل ہے۔

بقیہ صفحہ ۲۲ شمارہ نمبر ۸-۹

کے نعرے لگاتے ہوئے دم توڑیں۔ تو تیری توحید کی شہادت دیتے ہوئے جی کر اٹھیں تو تیرے نام کا کلمہ پڑھتے ہوئے، رفیق اور ساتھی ساتھ چھوڑتے رہیں، بٹتے رہیں، کٹتے رہیں، ٹوٹ ٹوٹ کر دشمنوں سے ملتے رہیں پر ہمارا قدم نہ ڈگمگائے، ہماری ہمتوں میں، وفاداریوں میں فرق نہ آئے، جب وہ ناگزیر وقت آئے کہ سارے سہارے بودے نکلیں اور سارے آسرے دغا دے جائیں تو اس وقت بھی دل کے اندر بسا ہوا تیرے قرآن کا بتایا ہوا دین اور روح کی گہرائیوں میں جاہ ہو۔ تیرے رسول کا لایا ہوا آئین اور لب و زبان پر آخری سانس کے ساتھ۔

وآخر دعوانا ان الحمد

للّٰہ

رب العٰلمین

ـــ ... ـــ ... ـــ

بقیہ صفحہ

بعض مسائل کے بارہ میں مولانا دریابادی مرحوم بھی اپنی کوئی انفرادی رائے رکھتے تھے۔ شخصیت سے قطع نظر یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ جمہور علماء امت کی رائے سے اختلاف میں سخت خطرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی لغزشوں اور غلطیوں کو معاف فرمائے اسی کے رحم و کرم سے ہی امید کی جاتی ہے۔

مولانا مرحوم کی ایک وصیت اور پیغام:

راقم سطور کو مولانا مرحوم کی صاحبزادیوں کا یہ پیغام پہونچا ہے کہ مولانا یہ وصیت فرما گئے ہیں کہ جن لوگوں سے ان کا کوئی تعلق اور واسطہ کبھی رہا ہو ان تک ان کا یہ پیغام کسی طرح پہونچا دیا جائے کہ وہ ان کی ناروا باتوں کو ان کے لیے معاف فرما دیں اور دعائے مغفرت فرمائیں۔ یہ عاجز اپنی طرف سے بھی اُن سب حضرات سے بھی گزارش کرتا ہے جن کی نظر سے یہ سطریں گذریں کسی مومن بندہ کے لئے اخلاص سے مغفرت کی دعا اور اپنے حق کو معاف کر دینا اتنی بڑی نیکی ہے کہ کیا عجب اللہ تعالیٰ اسی ایک نیکی پر خود اُس بندہ کی بھی مغفرت فرمادے۔

میری سرگذشت

مولانا عبدالماجد دریابادی

لکھنؤ سے پورب کی جانب فیض آباد کو ریل سے چلئے جو خود اودھ کا دارالحکومت رہ چکا ہے۔ شجاع الدولہ کے زمانہ تک تو آدھو آدھ پر ایک اسٹیشن ملے گا۔ دریاباد۔ اسٹیشن سے ڈیڑھ میل دور شمال میں چلئے تو اصل قصبہ میں پہونچ جائیے۔ اودھ کے قصبات میں تھوڑی بہت امتیازی حیثیت رکھے ہوئے۔ شروع انگریزی حکومت میں بجائے بارہ بنکی کے یہی ضلع تھا۔ اب ضلع کیا معنی تحصیل بھی نہیں۔

قصبہ کی بنیاد آج سے کوئی ۵۰۰ سال قبل شاہان شرقیہ جونپور کے زمانہ میں پڑی۔ اس وقت ان اطراف کے حاکم کوئی صاحب دریاخاں نامے تھے۔ وہی میرے خاندان کے مورث اعلیٰ شاہ مخدوم محمد آبکش خلیفہ ابوالفتح کانپوری کو ایک متصل قصبہ محمود آباد سے لے آئے اور اپنے نام پر قصبہ کو آباد کرایا۔

اسی قصبہ کے ایک قدوائی خاندان میں اس ننگ خلائق کی پیدائش وسط مارچ ۱۸۹۲ء میں ہوئی۔ سنہ ہجری کا مہینہ شعبان کا تھا (انگریزی کی بھی تاریخ غالباً ۱۶ تھی) نام ابھی قدوائی خاندان کا آیا ہے۔ دو لفظوں میں اس کی بابت بھی سن لیجئے۔ کہا جاتا ہے کہ ہمارے بزرگ قاضی معز الدین تھے جنھیں لوگ احتراماً قدوۃ العلم والدین کہتے تھے۔ قاضی قدوہ اسی کا مخفف ہے۔ مشہور ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے ہم عصر تھے۔ ہندوستان آکر قصبہ اجودھیا (ضلع فیض آباد) میں آباد ہوئے۔ (اجودھیا ہی کا دوسرا نام اودھ ہے) اور ان کی اولاد اودھ کے قصبات میں پھیل گئی۔ بڑا گاؤں، گدیہ، سسول، دسولی، جگور، بھیارہ وغیرہ میں اب تک ان کی آبادیاں موجود ہیں۔ ہمارے نسب ناموں میں اُن کا اسرائیلی ہونا درج ہے۔ حضرت ہارون کی نسل سے تھے جن کا سلسلہ بائیبل میں درج ہوئے شجرہ کے مطابق لاوی بن یعقوب پر ختم ہوتا ہے۔ اودھ کے عربی النسل شیوخ (صدیقی، عثمانی وغیرہ) بلکہ سادات تک نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور مناکحت کے رشتے ان سے کثرت سے قائم تھے۔

میرے دادا چار بھائی تھے۔ منجھلے کا نام مفتی مظہر کریم تھا۔ چھوٹے کا نام مولوی حکیم نور کریم تھا۔ جو میرے حقیقی نانا بھی تھے ان کی عمر کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں گزرا اور طبیب سے بڑھ کر طبیب گر کی حیثیت سے شہرت پائی مگر علاج اور مطب ایک خاص سن آجانے کے بعد قطعاً چھوڑ دیا تھا (مطب چھوڑنے کا سبب بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔ فرنگی محل سے بڑے خصوصی تعلقات تھے ایک مرتبہ وہاں سے طلبی آئی۔ دسمبر کی سردی تھی اور رات کا وقت۔ پہاوٹ کا پانی برس رہا تھا۔ کوئی سواری بھی اس وقت نہ ملی۔ پیدل چلے گئے واپسی میں جوڑوں اور ٹانگوں میں شدید درد پیدا ہوگیا۔ بس اسی وقت سے عہد کرلیا کہ پیشے چھوڑے دیتا ہوں۔ جب تک پیشہ کروں گا کہیں اور کسی وقت جانے سے انکار کیسے کروں گا) اور شغل صرف مدرسی کو بنالیا تھا۔ ساتھ ہی خطاط و خوشنویس بھی اعلیٰ درجے کے تھے۔ خدا جانے کتنی کتابیں، تاریخ، حدیث، تفسیر، لغت وغیرہ ہر علم و فن کی اپنے ہاتھ سے نقل کر ڈالیں۔ متعدد اب تک موجود ہیں۔ تالیف و ترجمہ سے بھی ذوق تھا۔ دو کتابیں زیادہ مقبول ہوئیں۔ ایک شفاء الامراض، دوسری ایک ترجمہ مخزن الادویہ۔ سال وفات ۱۸۷۷ء۔

دادا صاحب اپنے وقت کے ایک جید فقیہ و عالم تھے۔ تحصیل علم فرنگی محل (لکھنؤ) میں مولوی عبدالحکیم صاحب سے کی۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے وقت شاہجہاں پور میں کلکٹری میں سررشتہ دار تھے۔ الزام ان پر یہ لگا (خدا معلوم صحیح یا غلط) کہ باغی ان کے مکان پر جمع ہوکر بغاوت کے لئے منصوبے بناتے تھے اور یہ مذہبی فتوے دے کر انھیں اور اُکساتے تھے۔ بعد ختم شورش غدر مقدمہ چلا اور اسپیشل کمشنر شاہجہاں پور کی عدالت سے انھیں ۱۸۵۹ء میں نو سال کی سزا عبور دریائے شور (عوامی زبان میں کالے پانی) کی ہوئی اور ہندوستان کے متعدد علما، مثلاً مولوی فضل حق خیرآبادی اور مولوی قاضی عنایت احمد (مصنف تواریخ حبیب اِلٰہ) وغیرہ کا ساتھ رہا۔ اور اُن کو خود بھی کوئی عہدہ، محرری کا مل گیا (اس میں کیا مراد تھی یہ تو معلوم نہیں، لیکن بہر حال تھا تو لکھنے پڑھنے ہی کا شغل) وہیں رہ کر اُنھوں نے عربی کی لغت جغرافیہ کی مشہور کتاب مراصد الاطلاع کا اُردو ترجمہ بھی کر ڈالا۔ اس کا قلمی نسخہ انھیں کے قلم کا ہاتھ یہاں محفوظ ہے چھپا ہوا نسخہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن ایک مخلص نے ابھی کئی سال ہوئے اطلاع دی کہ انہوں نے ایک نسخہ انڈیا آفس لندن کی لائبریری میں دیکھا ہے قیدیوں کو "خوش اطواری" کی کچھ چھوٹ بھی ملا کرتی ہے۔ اس میں انھیں بھی کل پونے سات سال جلاوطنی میں رہ کر اکتوبر ۱۸۶۵ء میں پروانہ رہائی مل گیا اور وطن آکر فتویٰ نویسی وغیرہ میں مشغول رہے۔ وفات ۱۸۷۳ء میں پائی۔ پانچ لڑکیوں کے علاوہ اُن کے دو فرزند تھے۔ بڑے عبدالرحیم چھوٹے عبدالقادر ہیں میں انھیں چھوٹی اولاد کی چھوٹی اولاد ہوں۔ ایک بھائی اور ایک بہن دونوں مجھ سے بڑے تھے۔ بھائی عبدالمجید مرحوم کوئی آٹھ سال مجھ سے سن میں بڑے تھے لیکن اتنے فرق کے باوجود میں ان سے بڑا بےتکلف تھا۔ بیچارے دمہ کے مریض بچپن سے رہے باضابطہ تعلیم صرف انٹرمیڈیٹ تک پائی۔ یہ بھی اس زمانہ کے معیار سے کچھ کم نہ تھی۔ باقی کتب بینی سے اپنی استعداد ہر قسم کی بڑھالی تھی اور اشعار کے تو گویا چلتے پھرتے حافظ تھے خصوصاً مولانا شبلی اور مولوی ظفر علی خاں کے کلام کے۔ نائب تحصیلداری سے ملازمت میں داخل ہوئے اور ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر پہونچ کر پنشن لی۔ ۱۹۲۲ء میں کچھ دن سٹی مجسٹریٹی بھی کی۔ یہ عہدہ ایک خصوصی اہمیت رکھتا تھا۔ خاصے مذہبی تھے۔ نماز کے پابند منکسر المزاج اور لوگوں کے بڑے ہمدرد، خصوصاً کمزوروں کے ساتھ۔ ... پنشن کے بعد پبلک کے عام رفاہی کاموں میں پوری دلچسپی لیتے رہے بہن سن میں ۴-۵ سال بڑی تھیں اور بڑی عابدہ صالحہ تھیں۔ گویا معصوم صفت، شادی چچازاد بھائی ڈاکٹر محمد سلیم کے ساتھ ہوئی۔ اولاد کوئی نہیں ہوئی۔ اپریل ۱۹۳۵ء میں وفات پائی۔ والد ماجد کا ذکر زیادہ تفصیل سے کرنا تھا۔ اس لئے اسے عمداً موخر کردیا۔ اُن کا سال پیدائش ۱۸۳۹ء تھا تعلیم حسب رواج فارسی و عربی کی بھی خاصی پائی۔ زیادہ تر فرنگی محل میں پڑھا۔ اور مولوی محمد نعیم صاحب فرنگی محلی سے عقیدت شاگردانہ آخر تک رہی بڑے سن پر پہنچ کر انگریزی کی بھی بقدر ضرورت تحصیل کرلی تھی۔ ملازمت کی ابتدا اسکول کی مدرسی سے ہوئی! کسی انگریز حاکم کو پڑھایا۔ اس نے خوش ہوکر عدالت میں سررشتہ دار بنادیا۔ اس سے ترقی کرکے تحصیلدار اور پھر ڈپٹی کلکٹر ہوگئے ڈپٹی کلکٹری اس زمانہ میں معراج ترقی تھی۔ پنشن کے وقت سیتاپور میں تھے۔ نماز، روزے، مختصر وظیفے کے پورے پابند تھے علمی صحبتوں کے حریص تھے اور کتابوں کے علاوہ اخبار بھی خوب پڑھا کرتے۔ بعد پنشن لکھنؤ کے اُردو روزنامہ اودھ اخبار میں مضمون نگاری بھی کرتے رہے۔

۱۹۱۲ء میں بیوی، لڑکی وغیرہ کے چھوٹے سے قافلے کو لے کر حج کو گئے اور حتیٰ بعد فرائض حج ۱۱ یا ۱۲ ذی الحجہ کو ہیضہ میں مبتلا ہوئے اور ۱۳، ۱۴ ذی الحجہ کو عین فجر کے وقت داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے رخصت ہوگئے۔ قطعہ تاریخ حضرت اکبر الٰہ آبادی نے کہا۔ آخری شعر تھا

اسعد و معروف ذکر و شغل تھے
شغل، ہی سے نکلی تاریخ وفات
(۱۳۳۰ھ)

نکاح، سگی چچازاد بی بی نصیر النساء کے ساتھ ہوا تھا۔ اُن کو میں نے جب دیکھا تہجد گزار پایا۔ قرآن مجید ناظرہ پڑھی ہوئی تھیں۔ تلاوت کسی حال میں ناغہ نہ ہوتی۔ ۱۹۴۱ء میں وفات پائی۔ ۸۲-۸۳ سال کی عمر میں۔

دستور برادری اور گھرانے میں پانچویں برس بسم اللہ خوانی کا تھا۔ اپنی عمر ابھی چوتھے ہی سال اور ۱۸۹۵ء تھا کہ بسم اللہ کرانا طے پا گئی۔ والد مرحوم لکھیم پور کھیری میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ایک سہ پہر کو محفل آراستہ ہوئی اور وطن کے ایک خوش اوقات و خوش صفات عالم صاحب، جو بھائی صاحب کی اتالیقی پر مامور تھے۔ وہ زنانہ مکان کے صحن میں بسم اللہ کرانے بیٹھے۔ مٹھائی کے خوان سامنے رکھے ہوئے اور عزیزوں، نوکروں چاکروں کا گروہ حلقہ جمائے ہوئے۔ مولوی صاحب بیچارے نے پیار و شفقت کے لہجہ میں کہا کہ کہو بسم اللہ یہاں جواب میں قطعی خاموشی۔ اب اور لوگ بھی ان کے شریک کار ہوئے لیکن اس ضدی لڑکے کی زبان پر بدستور قفل لگا ہوا تھا۔ والد مرحوم کو آخر غصہ آیا۔ اور کب تک نہ آتا سمجھانے بجھانے، چمکانے کی حد ہوچکی تھی چھڑی ہاتھ میں لے انہوں نے جمانا شروع کردی۔ لوگوں نے ہائیں ہائیں کرکے کسی طرح جان بچائی۔ جلمنوں کی آڑ سے والدہ بشریہ تکلیف دہ تماشا دیکھتی رہیں اندر بلایا سمجھایا۔ آخر میں جو میری کھلائی تھیں اُن بیچاری نے کہا کہ وہ

میرے بھیا کو کیا بسم اللہ کہنا آتا نہیں میں نے کہا آتا کیوں نہیں، بس میں ان کے ساتھ چلا، مولوی صاحب کے کمرے کے باہر ہی سے انھیں چلا کر سُنا آیا۔ اُداسی خوشی سے بدلی چہروں پر ہنسی اور مسکراہٹ آئی۔ اسی کو کہتے ہیں،

"ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سرنوشت کو!"

زندگی کا یہی سب سے پہلا اہم واقعہ ہے۔

گھر پر قرآن مجید ناظرہ اور فارسی کی وہی تعلیم رہی جس کا اس وقت شریف مسلمانوں کے ہاں رواج تھا۔ اُردو میں مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی ریڈریں اپنے رنگ میں بہترین کتابیں تھیں۔ فارسی میں گلستاں بوستاں اور سکندر نامہ پڑھا، اور امام غزالی کی فارسی کتاب کیمیائے سعادت بھی جو اپنے فن کی بہترین کتاب ہے لیکن اول تو اتنی کم سنی میں پڑھنے اور سمجھ میں آنے کے قابل نہیں، دوسرے اس کا پڑھانا بھی ہر اُستاد کا کام نہیں اور ہاں اسی اعلیٰ کتاب کے پہلو بہ پہلو وہ گندی کتاب یوسف و زلیخا بھی پڑھنا پڑی۔ صرف اس لئے کہ وہ منسوب مُلا جامی کی طرف ہے عربی کی شُد بُد شروع ہی کی تھی کہ اسکول میں عربی لے لی۔ اب سن کوئی ۱۱، ۱۲ سال کا تھا پڑھائی سیتاپور کے ہائی اسکول میں ہو رہی تھی۔ عربی کے پہلے استاد لکھنؤ کے ایک ذی استعداد شیعہ حکیم محمد ذکی مرحوم تھے۔ مجھ پر بڑے مہربان تھے۔ کچھ روز بعد فرنگی محل کے ایک ذی علم اُستاد مولوی عظمت مرحوم آگئے۔ عربی ٹوٹی پھوٹی کچھ جو کچھ بھی آئی اُن کی بدولت آئی۔ بڑے شفیق بھی تھے اور قابل و فاضل بھی۔

اسکول کا ہر درجہ کھٹا کھٹ پاس کرکے ۱۹۰۷ء میں دسویں میں آگیا۔ ہاں حساب میں بہت ہی کمزور تھا اور یہ کمزوری انہوں ہی کے ہاتھ آئی تھی۔ اپنے بھائیوں ہی نے کہنا شروع کردیا تھا کہ اب ساتویں سے جامیٹری اور الجبرا بھی پڑھو گے اور حساب تو مسلمانوں کو آتا نہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ تم کیسی پوزیشن حاصل کروگے یہ سُن سُنا کر واقعی ہمت پست ہوگئی اور نفسیاتی مرعوبیت ایسی غالب آگئی کہ ادھر حساب کا سوال سامنے اور اُدھر دل کانپنے لگا۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر بابو گھمنڈی لال ایک دانشمند اُستاد تھے اور مجھ پر بہت عنایت کرنے والے انہوں نے یہ دیکھ، میرے ہی ایک اچھے ہندو ساتھی کو حکم دیدیا کہ انھیں اسکول کے بعد آدھ گھنٹے کے لئے روک کر اس میں سوال حساب کے کرادیا کرو تاکہ ان کی جھجک مٹ جائے اور ہمت کُھل جائے، اس ساتھی بیچارے نے یہ فرض تن دہی سے ادا کیا اور بعد کو جب میں نے کچھ نقدی بطور معاوضہ کے دینا چاہی تو کسی طرح اُسے قبول نہ کیا۔ حالانکہ بیچارے کی معاشی حالت حاجت مندی کی سطح تک پہونچی ہوئی تھی۔ شرافت کسی خاص قوم و مذہب کے ساتھ مخصوص نہیں غرض سواں سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوگیا۔ اسکولی تعلیم ختم کرکے جولائی ۱۹۰۸ء میں آکر کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوا۔ انٹرمیڈیٹ میں منطق اور انگریزی مضمون نگاری میں بہت اچھا رہا۔ انگلش ہسٹری میں کمزور عربی میں اوسط درجہ کا۔ بی۔ اے میں آیا تو سائیکلوجی میں نام پیدا ہوگیا۔ اور انگریزی مضمون نگاری میں بہت اچھے نمبر ملنے لگے۔

۱۹۱۲ء میں بی۔ اے سیکنڈ ڈویژن پاس کرلیا۔ ایم۔ اے فلسفے کا انتظام لکھنؤ میں نہ تھا۔ علی گڑھ گیا وہاں انتظام تو تھا مگر کچھ یوں ہی سا۔ زیادہ جی نہ لگا اور کورس کی ایک کتاب تو دستیاب ہی نہ ہوئی بس ۱۹۱۳ء میں امتحان دینے الٰہ آباد گیا (علی گڑھ اس وقت تک محض کالج تھا یونیورسٹی نہ تھا) وہاں مولانا شبلی کے بھائی جنید صاحب نامور ایڈوکیٹ کے ہاں ٹھہرا۔ امتحان میں ناکام رہا۔ اسباب ناکامی کا ذکر کچھ غیر ضروری طوالت کا باعث ہوگا۔

۱۹۱۳ء میں ہی ایم۔ اے کرنے دہلی گیا۔ سینٹ اسٹیفن کالج میں داخل ہوا۔ والد مرحوم کا انتقال ۱۹۱۲ء کے آخر میں ہوچکا تھا۔ اور اب جو کچھ گھر میں روپیہ تھا ایک چلتے ہوئے بنک میں جمع تھا۔ اتنے میں خبر آئی کہ وہ بنک ٹوٹ گیا اور جو روپیہ اس میں تھا وہ ڈوب گیا۔ اپنا دل دہلی سے اُچاٹ اور لکھنؤ کے لئے بیتاب تھا ہی اس لئے بہانہ اچھا ہاتھ آگیا اور ایم۔ اے کی تعلیم ادھوری چھوڑ لکھنؤ واپس آگیا۔ خیال یہ قائم کیا دو برس کے عرصے میں انگریزی رسالوں میں مقالے فلسفہ پر لکھ کر ایم۔ اے کی ڈگری کا کفارہ کرلوں گا۔ لڑکپن کی نادانیاں اور خوش خیالیاں!

اب تلاش معاش شروع ہوئی۔ بڑی اُمید اس کی تھی کہ اپنے ہی کیننگ کالج میں فلسفہ منطق کے جونیر لکچرر کی جگہ پر آجاؤں گا۔ میونسپل ڈاکٹر کیمرن بھی بہت خوش تھے مگر امید بر نہ آئی تقرر ایک دوسرے صاحب کا ہوگیا۔ ریلوے اور ڈاکخانے میں کچھ مناسب جگہیں نکلیں کوششیں کی اور ریلوے کے لئے تو راجہ صاحب محمود آباد نے زبردست سفارش کی بے سود رہی۔ انجمن ترقی اُردو کے سکریٹری بابائے اُردو مولوی عبدالحق بہت کام آئے۔ بیچارے نے بعض انگریزی کتابوں کے ترجمے معقول اُجرت پر کرانے شروع کردئے یہ امداد بہت غنیمت معلوم ہوئی۔ اس سے ذرا قبل مولانا شبلی مرحوم اپنی زیر تصنیف سیرۃ النبی کے سلسلے میں انگریزی ماخذوں کی تلاش کے لئے گھنٹہ دو گھنٹے کام کے لئے ۵۰ روپیہ ماہوار دیتے تھے۔

والد صاحب کے انتقال سے آمدنی کا اصل ذریعہ تو بند ہی ہوگیا تھا۔ بھائی صاحب کی تنخواہ نائب تحصیلداری کی خود ہی قلیل تھی۔ پورے خاندان کا اسی سے خرچ چلانا دشوار ہو رہا تھا۔

۱۹۱۶ء تھا۔ جون میں شادی ہوئی۔ خرچ کا بار قدرتاً بڑھ گیا تھا۔ علی گڑھ کے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے قدر افزائی اور کانفرنس میں بطور لٹریری اسسٹنٹ کے بلالیا۔ تنخواہ پونے دو سو ماہوار، مکان بلا کرایہ، یوں بھی تنخواہ وقت کے معیار سے بے جا نہ تھی اور پھر میں تو حاجت مند بھی تھا۔ صاحبزادہ صاحب بڑی شفقت و عنایت سے پیش آتے رہے لیکن اسے کیا کہئے کہ "ٹیڑھا لگا تھا قط قلم سرنوشت کو" ملازمت بہر حال ملازمت تھی طبیعت ہر قسم کے قید و بند کو بار سمجھ رہی تھی، تیار نہ ہو پائی اور دو ہی مہینے کے بعد اندر خرابی صحت کا بہانہ کرکے وہاں سے استعفا دے دیا۔

۱۹۱۷ء آگیا۔ حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی کی داغ بیل پڑی اور اس کے لئے بطور پیش خیمہ ایک نیا محکمہ سررشتہ تالیف و ترجمہ کھلا۔ مولوی عبدالحق صاحب کی نظامت میں، اور میں اس کے لئے بحیثیت مترجم فلسفہ مقرر ہوا۔ تنخواہ کا آغاز تین سو سے ہوا۔ یعنی آج ۱۹۶۰ء کے تین ہزار کے مساوی گیا اور گیارہ مہینہ وہاں قیام کیا۔

طبیعت کی بے قیدی یہاں بھی رنگ لائی۔ خیالات اپنے الگ ملحدانہ تھے، دکن کی مذہبی صحافت کو (جیسی کچھ بھی وہ تھی) ایک موقعہ شدید نکتہ چینی کا ہاتھ آگیا خوب خوب حملے ہوئے۔ یکم ستمبر ۱۹۱۷ء کو یہاں پہونچا تھا آخر جولائی ۱۹۱۸ء تک مشکل سے نباہ کیا پھر چھٹی لے کر لکھنؤ آیا اور یہاں سے استعفا بھیج دیا۔

۸-۱۰ مہینے پھر بیکاری میں گزرے عرض حال لکھ کر سراین جنگ چیف سکریٹری پیش گاہ مبارک کی خدمت میں بھیجا یہ قیام حیدرآباد کے زمانہ میں مجھ پر بہت ہی مہربان رہے تھے۔ کئی ہفتے کے بعد اُن کا تار آیا کہ نظام دکن کی خدمت میں پیش ہونے کے لئے تیار ہوکر آجاؤ۔ گیا۔ اب کی سرکاری مہمان کی حیثیت سے نواب صدر یار جنگ صدر الصدور امور مذہبی کے یہاں ٹھہرایا گیا۔ پیشی ہوئی اور کوئی ۳۰ سنٹ تک باریابی رہی، ۱۲۵ روپے ماہوار کی پنشن تاحیات منظور ہوئی۔ اور کام صرف مولانا شبلی کی طرح کتابوں کو سلسلہ آصفیہ سے منسوب کردینا۔ ظاہر ہے کہ اس سے آسان تر صورت اور کیا ہوسکتی تھی۔ قیام کی کوئی قید نہیں، جہاں چاہوں رہوں۔

۱۹۲۲ء میں یعنی اجراء پنشن کے ۲۰-۲۲ سال بعد جب روپے کی قیمت گھٹ گئی تو یہ رقم بھی عملاً اپنی چوتھائی رہ گئی۔ اب صدر اعظم نواب امین الملک سرمرزا محمد اسمٰعیل تھے جو مہاراجہ بنگلور میرے قدیم مہربان اب نواب ہوشیار جنگ تھے اور اعلیٰ حضرت کے مقرب خاص۔ انہوں نے میرا معاملہ سرامین الملک کے سامنے پیش کیا اور اس میں اضافہ ہوکر پنشن اب دو سو ماہوار ہوگئی۔ دو ہزار کی رقم نقد عطا ہوئی۔ ۱۹۴۸ء میں جب پولیس ایکشن ہوا اور سلطنت آصفیہ ختم ہوئی یہ پنشن بھی بند ہوگئی۔ یہاں سے مولانا ابوالکلام وزیر تعلیمات نے لکھا پڑھی کی۔ آخر میں خود پنڈت جواہر لال نہرو نے لکھا، جب جا کر ۱۹۵۵ء میں بحال ہوئی۔ پوری رقم دو سو کی نہیں بلکہ وہی قدیم ایک سو پچیس کی جزوی بحالی کے بعد رقم خزانہ حیدرآباد سے منتقل ہوکر اب خزانہ لکھنؤ میں آگئی اور اب تک یہیں سے مل رہی ہے۔

پڑھنے کا شوق بچپن سے تھا جہاں کوئی چیز چھپی ہوئی سامنے آئی، عام اس سے کہ رسالہ ہو یا کتاب یا اخبار یا اشتہار بس اسے پڑھنا شروع کردیا۔ رطب و یابس کی کوئی تمیز نہیں، ساتویں درجہ میں تھا۔ اور عمر کے بارہویں سال میں کہ اودھ اخبار (لکھنؤ) میں مراسلے اور مضمون بھیجنے لگا۔ نام سے نہیں کسی فرضی نام سے اور یہ زیادہ تر والد ماجد کے ڈر تھا، اور کچھ اپنے طبعی شرمیلے پن سے بھی۔ آٹھویں درجہ میں پہونچا، تو ایک کتاب ہی مرتب کرڈالی۔ عیسائیوں کے جواب میں مولوی محمد علی مونگیری (ربانی ندوہ) ایک ماہنامہ نکالتے تھے تحفۂ محمدیہ کانپور سے اسی میں سے مضامین مرتب کرلئے گئے تھے۔ گورکھپور کے ایک وکیل صاحب تھے مولوی احسان اختر عباسی چریا کوٹی، ان کی کتابیں بھی خوب پڑھ لیں تھیں۔ الاسلام وغیرہ ان سے بھی لے لے کر مضمون لکھا کرتا تھا۔ وقت کے چلے ہوئے عنوانات پر اور دائرہ اب اودھ اخبار سے وسیع ہوکر ریاض الاخبار (گورکھپور) اور اخبار الاسلام (امرتسر) تک پہونچ چکا تھا۔

ایک چھوٹا سا کلب بھی بعض ہم سن لڑکوں اور باہر والوں سے مل کر قائم کیا تھا فرینڈز کلب کے نام سے ایک آدھ ہندو بھی اسکے ممبر تھے، اس کے ہفتہ وار جلسے بھی ہمارے

ہی ہاں ہوا کرتے۔ علاوہ دوسرے پرچوں کے علی گڑھ منتھلی بھی اس میں آتا تھا، آدھا اردو میں آدھا انگریزی میں۔ ایک آدھ مقالہ بھی اس کلب میں سنایا۔ انگریزی کتابیں اسکول لائبریری سے لایا کرتا۔ ۱۹۰۸ء میں لکھنؤ مستقل طور پر آگیا۔ کالج میں پڑھنے لگا۔ کتب بینی اور رسائل بینی وسیع ہوگئی تھی۔ اب ملک بھر کے رسالے اور اخبار رفاہِ عام لائبریری، ایڈووکیٹ لائبریری اور سب سے بڑھ کر کیننگ کالج لائبریری سب کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ۱۹۱۱ء میں جب سے امیر الدولہ پبلک لائبریری کھل گئی، اُس کے چکر متواتر اور کثرت سے لگنے لگے۔ لائبریری ہی میں اگر کبھی چھٹی ہوتی تو وہ دن بہت کھلتا اور طبیعت برابر بے چین رہتی۔ کالج ڈبیٹنگ کلب میں تو خود کبھی زیادہ نہیں بولا، البتہ دوسرے مقرروں کو برابر مدد دیتا رہتا۔ مسلمانوں کا ایک سنجیدہ سہ روزہ امرتسر سے وکیل نامی نکلتا تھا۔ ۱۹۰۸ء، ۱۹۰۹ء میں اس میں بھی دو لمبے مضامین لکھے۔ ایک کا عنوان تھا "محمود غزنوی" اور دوسرے کا "غذائے انسانی"۔ بعد کو وکیل بک ایجنسی نے انھیں کو رسالوں کی صورت میں شائع کردیا اور ان کی خوب دھوم رہی۔

۱۹۱۰ء تھا کہ لکھنؤ کے نئے ماہنامہ "الناظر" میں مولانا شبلی کی "الکلام" پر تنقیدی نظر کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا اور اس کے بڑے چرچے اُس زمانے میں رہے۔ پھر الناظر سے تو جیسے مستقل تعلق ہوگیا۔ برسوں اسی میں مضمون نکلتے رہے۔ کچھ نام سے اور کچھ فرضی ناموں سے۔ الٰہ آباد سے ایک ادبی ماہنامہ آب و تاب سے ادیب کے نام سے نکلا تھا۔ اس میں بھی ۱۹۱۲ء، ۱۹۱۳ء میں مضمون لکھے۔ الندوہ (لکھنؤ) کا معیار بہت بلند تھا۔ ۱۹۱۲ء میں اس میں ایک آدھ مضمون انگریزی سے ترجمہ کرکے دیا اور اس کے مضمون نگاروں کی فہرست میں اپنا نام دیکھ لیا۔

کالج چھوڑنے کے بعد مستقل قیام لکھنؤ ہی میں رہا۔ لکھنؤ اپنا وطن بن چکا تھا۔ مضمون نگاری کا سلسلہ اردو، انگریزی دونوں میں رہا۔

معارف میں مضمون تو شروع ہی سے نکلنے لگے تھے۔ ۱۹۱۹ء میں اس سے باضابطہ ادارتی تعلق پیدا ہوگیا جو غالباً ۱۹۲۳ء تک قائم رہا۔ مولانا محمد علی کے روزنامہ ہمدرد کی نگرانی ۱۹۲۵ء سے اپنے ذمہ رہی باقی اس سے گہرا ادبی تعلق شروع ہی یعنی ۱۹۱۳ء سے تھا۔

۱۹۲۵ء سے اپنا ہفتہ وار لکھنؤ سے "سچ" کے نام سے نکالا پہلے ظفر الملک علوی کی شرکت میں اور پھر اپنا کرلیا۔

ایک دوست نے اسی زمانہ میں فرمائش کی جدید تعلیم کے طریقوں پر ایک چھوٹا سا رسالہ لکھ دو۔ اس وقت تک عادت رات کو کام کرنے کی زیادہ تھی ایک رات کو اور زیادہ جاگ کر چند گھنٹے کے اندر مسودہ تیار کردیا "فرائض والدین" کے عنوان سے ایک "خادم تعلیم" کی طرف سے نقد نقد معاوضہ اسی وقت ہاتھ آگیا۔ ان دنوں میں ادیب معارف وغیرہ بھی معاوضہ دیتے تھے۔

فلسفۂ جذبات اور فلسفۂ اجتماع کو بعد میں اپنی فہرست تصانیف سے خارج کرچکا ہوں۔ برکلے فلسفی کے مکالمات کا ترجمہ (شائع کردیا دار المصنفین) بھی اسی عہد کی یادگار ہے۔ لیکی کی ہسٹری آف یورپین مارلس کا ترجمہ تاریخ اخلاق یورپ (دو جلدوں میں) اور بکل کی ہسٹری آف سولیزیشن ان انگلینڈ، (تاریخ تمدن انگلستان) کی تین جلدوں میں سے بیشتر حصہ کا ترجمہ یہ سب اسی عہد کی پیداوار ہیں۔ آمدنی کا ذریعہ بس یہی رہ گیا تھا ایک گمنام ڈرامے کا ذکر رہا ہی جاتا ہے ۱۹۱۵ء میں زود پشیمان کے نام سے ناظر کی طرف سے شائع ہوا۔ اس کا ابتدائی مسودہ ریل کے ایک سفر میں، کانپور سے بمبئی تک میں تیار ہوگیا تھا۔

حیدرآباد میں جب یکم ستمبر ۱۹۱۷ء سے اخیر جولائی ۱۹۱۸ء تک رہا تو ایک خاصی ضخیم کتاب منطق پر تیار کردی نام تھا ایک پرانی کتاب کی نظر ثانی کا لیکن نظر ثانی ہی میں گویا وہ ایک نئی کتاب ہی بن گئی۔ وقت بچ رہا تھا اس میں اپنے فن سے باہر ایک تاریخ یورپ کے ترجمہ کا تکملہ کردیا۔ یہ دونوں کتابیں سررشتہ تالیف و ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے چھپیں۔

اگست ۱۹۱۸ء میں لکھنؤ واپس آگیا اور اب اپنی مستقل تصنیف و تالیف کا دور شروع ہوگیا۔ پہلے ایک چھوٹی سی کتاب تحفۂ خسروی چھپی ہے یہ محض ایک مجموعہ قرآن، حدیث اور سعدی وغیرہ کے اقتباسات کا شعر و ادب کے علاوہ تمام تر مغربی فلسفہ کے ماہرین کے افکار زیرِ مطالعہ آئے۔ برطانوی فلسفی اسپنسر مل وغیرہ تو گویا نوکِ زبان تھے ۱۹۱۸ء کے نصف آخر میں مطالعہ غیر مسلم فلسفہ و تصوف کا شروع ہوا۔ ہندو فلسفہ، بدھسٹ فلسفہ، چینی فلسفہ وغیرہ انگریزی کے ذریعہ سے۔

ہندو فلسفہ میں علاوہ گیتا کا انگریزی ترجمہ کے مسز بیسنٹ، ملک بھگوان داس، آربندو گھوش وغیرہ کی تحریروں کا مطالعہ رہا۔ ماہنامہ صبح امید (لکھنؤ) میں کچھ مضمون نگاری اسی رنگ کی شروع کی اور پھر مثنوی رومی کے مطالعہ نے گویا اس پر مہر لگادی اور مولانا شبلی کی سیرت النبی کی جلد اول بھی اس میں بڑی معین ہوئی۔ اب قلم کا رنگ ہی دوسرا ہوگیا۔ نفسیات مغربی کا غیر مضر اور صالح حصہ اب بھی قلم کا موضوع تھا۔ مبادیٔ فلسفہ یا فلسفہ کی پہلی کتاب اور مبادیٔ فلسفہ، فلسفہ کی دوسری کتاب اور ہم آپ سب اسی رنگ کی نکلیں۔ پھر چھوٹے چھوٹے مقالے، رامپور، پشاور، علی گڑھ میں پڑھے ہوئے رسالوں کی صورت میں شائع ہوئے۔ قصص و مسائل تمدن اسلام کا پیام تمدن اسلام کی کہانی۔ جدید قصص الانبیاء وغیرہ انگریزی ترجمہ و تفسیر قرآن دونوں کا ولولہ باوجود اپنی بے علمی، کم استعدادی کے پیدا ہوگیا۔ چھ سات سال کی مدت میں کام ختم ہوا۔ اور تاج کمپنی لاہور نے اس کا کاپی رائٹ دیکر خرید لیا۔ پھر اردو تفسیر کی نوبت آئی اور پہلے ایڈیشن کے بعد، توفیق الٰہی نے کامل نظر ثانی معقول و معتد بہ اضافہ کے ساتھ، دوسرے ایڈیشن کے لئے دستگیری کی، پہلی جلد اس کی نکل چکی ہے اور دوسری جلد بھی انشاء اللہ آج ہی کل میں نکلنے والی ہے[1]۔ پانچ جلدیں اس کے بعد بھی باقی رہیں گی اور اس کی طبع و اشاعت کا اللہ ہی مالک ہے۔ مطالعہ قرآنی کے سلسلہ میں چھوٹے بڑے رسالے بھی کئی نکل چکے ہیں۔ تاج کمپنی (کراچی) نے انگریزی میں محض ترجمہ قرآن (بلا تفسیر) کی فرمائش ابھی دو ہی چار سال ہوئے کی، اور جوں توں فرمائش پوری کردی گئی۔ ترجمہ کی آخری قسط یہاں سے اکتوبر ۱۹۵۶ء میں روانہ کی گئی۔ شروع ۱۹۵۸ء میں افضل العلماء ڈاکٹر عبد الحق کرنولی مرحوم نے مدراس مدعو کیا کہ کسی قرآنی موضوع پر چھ لکچر آکر دیجئے۔ چنانچہ موضوع تقریباً اچھوتا اور جدید "سیرت نبویؐ قرآن سے" اختیار کیا گیا اور فرمائش پوری کردی گئی۔ لکچروں کے دو ایڈیشن نکل چکے ایک اور کتاب بھی تمام تر قرآن سے ماخوذ اسی زمانہ میں تیار ہوگئی۔ "بشریتِ انبیاء" کے نام سے یہ موضوع بھی اب تک تقریباً اچھوتا ہی رہا ہے اور عین ان سطور کی تحریر کے وقت ایک دوسری فرمائش بھی لکچروں کی مدراس سے آئی ہے۔ اب کے موضوع اختیار کیا گیا ہے "مشکلات قرآن" یا قرآنی مطالعہ بیسویں صدی میں۔ یہ انتخاب اپنی تفسیر ہی سے ہوگا۔ اور اس کے خصوصی نکتے ان لکچروں میں ترمیم و تصرف کے بعد پیش کردئے جائیں گے۔

تفسیر ماجدی کے دوسرے ایڈیشن کی باقی جلدیں اپنی زندگی میں دیکھ لوں، یہی بات بڑی اور غیر معمولی سی بات ہوگی۔ ہر جلد پر مصارف اتنے آرہے ہیں کہ اللہ اگر ایک مخلص و سرمایہ دار بندے کو آگے نہ کردیتا تو کوئی صورت ہی طبع و اشاعت کی نہ تھی۔

مذہبی تحریروں کے ذکر کی رو میں یہ ذکر رہ ہی گیا کہ ادبی اور شعری ذوق بھی اسی دور میں فنا نہیں ہوا بلکہ برابر باقی ہی رہا۔ حضرت اکبر سے جو عقیدت رہی وہ خود ایک مستقل عنوانِ گفتگو ہوسکتا ہے۔ بہرحال کئی مضمونوں اور مضمونچوں کا مجموعہ اکبر نامہ کے نام سے اسی درمیان میں شائع ہوگیا۔ انشائے ماجد جلد اول و جلد دوم اور نشریات ماجد جلد اول کے نام سے کئی مجموعے تیار ہوکر شائع ہوئے۔ شخصیات میں جو عقیدت حضرت تھانویؒ اور مولانا محمد علیؒ سے رہی، اُس کا ذکر آگے آرہا ہے، بہرحال حکیم الامت کے نام سے ایک جلد حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی نذر ہوچکی اور محمد علی ذاتی ڈائری کے عنوان سے دو جلدیں محمد علی کی۔

ایمان و عقیدہ کی دنیا میں بار بار تبدیلیاں ہوئیں۔ بچپن بھر اور شروع جوانی میں سخت مذہبی رہا۔ عمر کے سترہویں سال سے اسلامیت میں ضعف پیدا ہونا شروع ہوا، انگریزی کتابیں پڑھ پڑھ کر۔ ان میں سے کسی میں اسلام پر حملہ براہ راست نہ تھا۔ بس ایسے معلومات و افکار جمع کردئے گئے جن سے زد جاکر اسلام پر پڑتی تھی۔ مثلاً رسول اسلامؐ کا فوٹو ایسا شائع کرنا (ایک مستند قلمی مرقع کے حوالے سے) جس میں شکل و صورت سے بجائے کسی قسم کی نرمی اور نرم دلی کے تمام تر خشونت اور اکھڑپن برس رہا ہو اور عبا کے ساتھ کمر میں تلوار پڑی ہو اور کاندھے پر تیر و کمان، اور اس پر مستزاد انگریزی کی ایسی کتابیں، ڈاکٹری یا نفسیات کے موضوع پر، جن میں ضمناً یہ درج ہو کہ صرع یا ہسٹریا کی ایک قسم ایسی ہے، جسے لوگوں نے "وحی" سے موسوم کیا ہے اور دوسری طرف وہ کتابیں جن میں نفس مذہب پر حملہ ہے — عبادت، عصمت، ضبط نفس، نفس کشی کی ہر صورت پر چھینٹے ہیں، اور اسراف حظ نفس، شہوت رانی وغیرہ کی حمایت کرکے اُن کی تبلیغ و اشاعت کا حق ادا کردیا گیا۔ ان سب کا بل ملاکر نتیجہ یہ ہوا کہ طبیعت اسلام کی طرف سے برگشتہ ہوگئی۔ اور نفس پر جادو الحاد و ارتداد کا چل گیا۔ بے تکلف لندن کی رشنلسٹ ایسوسی

[1] اب شائع ہوگئی ہے۔

ایشن کا ممبر بن گیا۔ اور اپنے کو کھلم کھلا رشنلسٹ (عقلیت پسند) یا ایگناسٹک (لاادری) کہنے لگا یہ بھی غنیمت ہوا کہ سوشل حیثیت سے مسلمان اس وقت بھی رہا یعنی مسلمانوں سے وہی میل جول، وہی مسلم برادری، وہی مسلم معیشت ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۸ء تک یعنی سترہویں سال سے لیکر ستائیسویں سال کی عمر تک یہی انداز فکر رہا۔ مغرب کی ٹھیٹھ مادیت کا بُت ہندو فلسفہ کے مطالعہ سے ٹوٹا۔ اور روحانیت کے نام سے بودھ اور ہندو بیزاری نہ رہی ڈیڑھ دو سال اسی حالت میں گزرے اور ۱۹۲۰ء سے کہنا چاہئے کہ یہ مرتد از سر نو اسلام لے آیا۔

دورِ ظلمت سے دورِ ہدایت تک پہونچنے میں جن حضرات سے مدد ملی ان میں ایک امتیازی درجہ مشہور شاعر حضرت اکبر الٰہ آبادی کا ہے۔ حکیم و عارف تھے کن کن لطیف حیلوں بہانوں سے مجھے رُشد و ہدایت کی طرف لاتے رہے۔ دوسرے رہبر اس سلسلے میں مولانا محمد علی تھے۔ ان سے مجھے محبت ہی نہیں، عشق تھا یہ ہر طرح ڈانٹ ڈپٹ کر میری اصلاح کے پیچھے پڑے رہتے۔ ہندوؤں میں بنارس کے فاضل فلسفی درویش بابو بھگوان داس کی باتیں بھی خوب بڑی مصلحانہ رہیں اور اس سلسلہ میں نام گاندھی جی کا بھی آتا ہے۔ چھوٹے بڑے ہادی و رہنما اور بھی ملتے رہے۔ قسمت نے یاوری کی کہ مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رسائی ہوگئی۔ جہاں کا رنگ سب سے نرالا تھا۔ یہاں سے جو کچھ پایا۔ بس اپنے ظرف کا منتہا وہی تھا۔

شوق اسکولی زندگی میں تھوڑا بہت کرکٹ اور ٹینس کا بھی رہا۔ لیکن زیادہ دلچسپی فٹ بال سے رہی اور اس میں بس اوسط درجہ کا کھلاڑی سمجھا جاتا رہا کالج میں آتے آتے پڑھنے کی ایسی لت پڑگئی کہ شام کے کھیل کا وقت بھی پڑھائی کی نذر ہوگیا کھیلنے دوڑنے کا کوئی وقت باقی نہ رہا ادھیڑ سن کے وقت تک ورزش پر مطلق توجہ نہ کی، ۴۵ سال کے بعد خیال آیا اور صبح تڑکے قبل فجر دوڑ کی مشق شروع کی نتیجہ یہ ہوا کہ فائدے سے زیادہ نقصان ہاتھ رہا۔

آخر میں سخت قسم کی ورزشوں سے توبہ کی اور ہلکی ورزش صبح ٹہلنے اور چلنے کی رکھی۔ مدتوں یہ معمول رہا۔ ابھی کئی سال سے یہ بھی چھوٹ گیا ہے صحت بحیثیت مجموعی اچھی ہے۔ بیمار نسبتاً کم ہوتا ہوں۔ کھانا ہر قسم کا بڑے شوق سے کھا لیتا ہوں۔ چائے ایک زمانہ میں بہت زیادہ پینے لگا تھا۔ اب نسبتاً کم کردی ہے۔ کان بہت اچھے رہے تھے اب سن کے تقاضے سے گراں گوشی پیدا ہوگئی ہے اور اس سے کہیں بڑھ کر تکلیف دہ ضعف بصارت ہے، اس کا سب سے تباہ کن اثر خط پر پڑا ہے۔ اپنا خط خود نہیں پڑھ پاتا ہوں۔ لکھنے میں کثرت سے حروف چھوٹ جاتے ہیں اور دور کی چیز تو بالکل ہی نہیں دیکھ سکتا ہوں۔

رات کو لکھنے پڑھنے کا کام سالہا سال سے بند ہے، اس ضعف بصارت کی وجہ، لڑکپن اور نوجوانی میں بڑی ہی بے احتیاطیاں تھیں۔ ناکافی اور دھندلی روشنی میں برابر مطالعہ کرتا رہتا تھا اور کبھی لیٹ کر بھی اس کا خمیازہ جوانی ہی میں بھگتنا پڑا بول کر لکھانے کی عادت نہیں۔ قلم جب ہاتھ میں آجاتا ہے تب ہی دماغ چلتا ہے۔ بڑا وقت خط و کتابت کی نذر ہوجاتا ہے۔ لوگ عجب عجب سوال لکھ بھیجتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ لوگ عمر فاروق کو فاروق اعظم کیوں کہتے ہیں کیا دوسرے فاروق بھی ہوئے ہیں اور یا یہ کہ حضرت یوسفؑ سے شادی کے وقت بی بی زلیخا کا کیا سن تھا اور اُن سے اولادیں کتنی ہوئیں وغیرہ۔ مروت میں اکثر جواب دیتے ہی بنتا ہے کوئی اسسٹنٹ یا معاون پاس نہیں۔ کتابیں مکان کے مختلف حصوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ انھیں اٹھ کر لانا اور حوالہ ڈھونڈھنے میں بڑا ہی وقت نکل جاتا ہے۔

شادی ہمارے ہاں ماں باپ کی پسند اور مرضی ہی سے ہوا کرتی ہے اور اکثر خاندان ہی کی کوئی لڑکی اپنے عزیز سے منسوب ہوجاتی ہے اپنی نسبت بھی اسی طریقہ سے بچپن ہی میں طے شدہ سمجھ لی گئی کسی نے مجھ سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی۔ جب میں کالج میں پڑھنے لگا تو خیالات میں انگریزیت کے ساتھ اس باب خاص میں بھی حمایت نے زور کیا۔ لڑکی میں اور کوئی برائی نہ تھی صورت شکل میں اوروں سے بہتر تھی۔ لیکن رہتی دیہات میں تھی۔ شہر کی آب و ہوا سے ناآشنا اور اپنے رنگ ترجیحوں کا ایک عیب ہی تھا۔ جب بی۔ اے کرچکا پھر والد ماجد کچھ دن بعد دنیا سے رخصت ہوگئے۔

والدہ ماجدہ کے کانوں تک یہ خبر اپنی ناراضگی کی پہونچا دی۔ وہ بیچاری بھی دق رہ گئیں کہ لڑکی والوں کو اب کیا منہ دکھاؤں گی لیکن قدرت کا انتظام دیکھئے کہ عین زمانہ میں ایک دوسری عزیزہ لڑکی نظر کے سامنے آگئی۔ میری ایک حقیقی خالہ کی پوتی تھی۔ عمر میں مجھ سے دو ہی چار سال چھوٹی رنگ روپ کی اچھی نکھری۔

اور بڑی بات یہ کہ قیام زیادہ تر لکھنؤ میں رہتا تھا۔ باضابطہ تعلیم تو کچھ ایسی ہی رہی۔ البتہ معاشرت بالکل شہری لکھنؤ میں قصباتی آداب سے خوب واقفیت وضع لباس، چال ڈھال سب شہریوں کی سی۔ بس یہ لڑکی دل میں کھُب گئی۔ میں بھاوج والدہ سب ڈر رہی تھیں کہ خدا معلوم کس کرسشان عورت کو گھر میں لے آؤں۔ اس انتخاب کی خبر سن کر سب باغ باغ ہوگئیں باقاعدہ پیام کا خط ادھر سے گیا اور اب حسب دستور پردہ ہوگیا۔ اتفاقات عجب عجب پیش آتے رہے۔ کبھی کسی عزیز قریب کا انتقال کبھی کچھ اور۔ دن ٹہلتے رہے اور فراق کی مدت کاٹنا مشکل ہوگیا۔ اشتیاق بڑھتا گیا اور محبت بڑھ کر عاشقی کے درجہ تک پہونچ گئی۔ بالآخر شروع جون ۱۹۱۶ء میں عقد خاصے دھوم دھام سے لکھنؤ میں ہوگیا مکان ان کا باندے میں تھا۔ جائیداد وہیں تھی۔ والد شیخ یوسف الزماں آنریری مجسٹریٹ اور رئیس تھے۔ بیوی جوان ہوئیں تو خوب مقبول ہوئیں۔ خاصی خوشحال تھیں۔ مگر میرے ہاں عین اس زمانہ میں تنگی اور ان بیچاری نے بڑے صبر و شکر کے ساتھ قناعت کی زندگی اختیار کرلی۔ اپنے برتاؤ سے سب کو خوش رکھا۔ خود مجھ سے البتہ کبھی کبھی جنگ ہوجاتی تھی۔ زیادہ تر مالی معاملات میں بحیثیت مجموعی زندگی بڑے شکر کی کٹی۔ درمیان میں ایک حاجت مند اور صاحب اولاد بیوہ سے میں نے عقد ثانی بھی کرلیا تھا اکتوبر ۱۹۳۸ء میں لیکن نباہ ان سے عرصہ تک نہ ہوسکا۔ ہر فریق کو کوفت ہی کوفت رہا کی۔ بمجبوراً خوش اسلوبی سے نرم الفاظ میں طلاق نامہ بھیج کر باقاعدہ علیحدگی اختیار کرلینا پڑی گو خود بڑی بہت خدمت کی توفیق اس کے بعد بھی ان کی زندگی بھر ہوتی رہی اگر اس باب میں کوئی زیادتی یا حق تلفی میری طرف سے ہوئی تو اللہ معاف فرمائے۔

اولادیں ہوئیں تو متعدد، زندہ چار ہی ہیں۔ چاروں لڑکیاں گھر ہی پر انھیں کچھ تعلیم دے دلاکر شادیاں چاروں مناسب سن والے بھتیجوں کے ساتھ خاموشی سے کردیں۔

جون ۱۹۱۶ء سے دسمبر ۱۹۷۵ء تک کا زمانہ بڑی ازدواجی مسرت و کامیابی کا گذرا (جس حد تک مسرت اس عالم ناسوت میں ممکن ہے) صحت بیچاری کی خاص طور سے خراب رہا کی۔ بلڈ پریشر، وجع مفاصل، متعدد امراض کی شکار، لیکن میرے لطف و مسرت میں کوئی فرق نہیں، اور طویل مدت مفارقت کو تو میں نے کبھی جانا ہی نہیں اور حق رفاقت جس طرح انھوں نے ادا کیا کم ہی کسی کو اس کا موقع ملتا ہے۔ دسمبر ۱۹۷۵ء میں بھتیجے انور الزماں ایڈووکیٹ باندے کی لڑکیوں کی شادی باندے میں تھی۔ بڑے شوق سے بلائی گئیں اور بڑے شوق سے گئیں۔ عین وقت پر میں بھی عقد میں شرکت کے لئے گیا۔ ۳ دن کے بعد واپس آگیا۔ خیال یہ تھا کہ ہفتہ عشرہ کے بعد یہ بھی واپس آجائیں گی یکم جنوری کو دریاباد واپس پہنچ گیا میں بیٹھا قرآن مجید ہی کا کام کررہا تھا کہ بے شان و گمان ایک موٹر میں دروازے پر آکر رکی اور میرا دل دھک سے ہوگیا۔ شاہ آواز علیم سلمہٗ کی آئی اور دل میں بجلی کوند سی گئی کہ کوئی شدید واقعہ پیش آگیا اور یہ مجھے بلانے کو آئے ہیں۔ کمرے میں داخل ہوئے اور روتے ہوئے بولے کہ جو کچھ میں کہنے آیا ہوں وہ کس زبان سے کہوں۔ میں نے دو سکنڈ کے تامل کے بعد جواب دیا۔ الحمد للہ۔ اللہ نے اپنی امانت واپس لے لی اور بہترین وقت واپس لی ہے پھر انہوں نے رو رو کر تفصیل بیان کی کہ "رات کو بارہ بجے ان کو قلب کا دورہ ہوا۔ ڈاکٹر اشرف (دوسرے بھتیجے) موجود ہی تھے۔ انھوں نے گولیاں دیں کچھ اثر نہ ہوا۔ دوڑ کر انجکشن لائے۔ اتنی دیر میں دو مرتبہ کلمہ شہادت پڑھ کر یہ رخصت ہوچکی تھیں۔ ڈاکٹر سر پکڑ کر بیٹھ گئے کہ دوا کا وقت گذر چکا تھا۔ باندے سے ٹرنک کال پر یہ اطلاع ۱۰ بجے صبح لکھنؤ ہوئی۔ موٹر آپ کے لئے لایا ہوں۔ گرتا پڑتا پہلے لکھنؤ میں پہونچا۔ مولانا علی میاں ندوی، مولانا محمد اویس ندوی نگرامی اور مولوی ہاشم فرنگی محلی گھر پر تعزیت کو موجود تھے۔ سہ پہر لاری میں خاندان بھر کو ساتھ لے کر ۱۱ بجے شب کو باندے پہونچا اور گھر میں قدم رکھ کر وہ منظر دیکھا کہ اب کیا بیان ہو۔ گذری جو کچھ گذرنا تھی۔ آہ وہ کفن پوشی کی چادر میں جنازہ قبرستان لے جایا گیا۔ نماز بھی اسی نے پڑھائی۔ قبر میں اُتار کر قبر بند کی اور مٹی ڈال دی۔ کون جان سکتا ہے کہ جس کو عمر بھر یہاں تک کہ اس ضعیفی میں بھی محبوبہ بناکر رکھا، اسی کے لئے یہ سب کچھ کرنا بھی اپنی قسمت میں تھا۔

نام کی عفت النساء ایک پیکر عفت تھی

مرحوم کی وفات کے وقت سے قلب میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے۔ اور ہنسی جیسے کہتے ہیں وہ ۱۱ مہینے ہو چکے ہیں کہ آج تک چہرہ پر نہیں آئی۔

سیاست ملکی میں زیادہ میں نہیں پڑا۔ البتہ جب سے کامریڈ نکلنا شروع ہوا تو میں اس کا حرف حرف پڑھنے لگا۔ ترکی سیاست اور عام اسلامی سیاست سے دلچسپی ہونے لگی پھر جب ۱۹۱۶ء میں مسز بیسنٹ بھی نظر بند ہوئیں تو اُن کی ذات سے عقیدت کی بنا پر دل کو ایک دھچکا سا لگا ہوم رول اور کانگرس کو اچھا سمجھنے لگا۔ پھر گاندھی جی کی تحریک ترک موالات اُٹھی اور اس کا علم بردار علمی حد تک بن گیا چنانچہ ماڈرن ریویو (کلکتہ) میں مضمون ستیہ گرہ اور اسلام پر لکھا اور پھر جب علی برادران گرفتار ہو کر کراچی کے مقدمہ میں سزایاب ہوئے تب سے تو تحریک خلافت کا بے داموں کا غلام بن گیا۔ مرکزی خلافت کمیٹی اور پھر اسکی ورکنگ کمیٹی کا ممبر بھی رہا اور خلافت کمیٹی کا صدر کئی سال تک رہا۔ ۱۹۲۱ء میں لکھنؤ میں خلافت کانفرنس کا جو اجلاس ہوا اس کی مجلس استقبالیہ کا صدر تھا جو ایڈریس اس میں پڑھا لوگوں نے اس کی بڑی ہمت افزائی کی۔ کانگرس اور مسلم لیگ دونوں سے ہمدردی رہی لیکن وہی دور دور کی اور جب محمد علی کا انتقال ہو گیا۔ سیاست سے بالکل قطع تعلق کر لیا۔ گاندھی جی کی دور اندیشی، تدبّر اور اخلاص سب کا مداح زندگی بھر رہا۔ اور ان کی بے وقت اور بے دردانہ موت ملک کے لئے ہی نہیں مسلمانوں کے لئے بھی ایک سانحہ ہے۔

عقیدت نثوفی صدی محمد علی سے رہی اور ان کے بعد خلافت کمیٹی سے الگ ہو گیا۔ مولانا عبد الباری فرنگی محلی کی عزت و وقعت دل میں قائم رہی۔ مالی خوشحالی زیادہ کبھی نہیں رہی بلکہ بعض دور تو خاصی تنگ حالی کے بھی گزرے ہیں۔ لیکن بھائی صاحب برابر اور مستقل مدد کرتے رہے، اور مخلصوں کی ایک تعداد بھی وقتاً فوقتاً ہدیے اور نذرانے پیش کرتی رہی ـــ حیدرآباد کی علمی پنشن ۲۰۰ روپے ماہوار تھی۔ پولیس ایکشن کے بعد بند ہو گئی۔ جب مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کی تحریک پر دوبارہ کھلی تو کل ۱۲۵ پر آ گئی۔ ۱۹۶۲ء سے ہند سرکار نے عربی اسکالر کی حیثیت سے ماہانہ پنشن مقرر کر دی۔ اس کی رقم اب تین ہزار سالانہ ہے، پہلے کم تھی۔

یوپی سرکار سے پنشن سو روپیہ ماہوار کی ملتی رہتی ہے۔ کچھ آمدنی کتابوں اور صدق سے ہو جاتی ہے۔ سورت اور پھر ملایا کے سیٹھ داد اجانی نے ایک بار کئی ہزار کی رقم پیش کی تھی اور ایک اور مخلص بھی جن کا نام کچھ ہے، پتا معقول رقم پیش کرتے ہے مدراس میں مجھے لکچر دینے کا موقع مل گیا تھا۔ عین اس وقت پھر وہی صورت نکل رہی ہے۔

مدتوں قیام طالب علمی ختم ہونے کے بعد بھی لکھنؤ ہی میں رہا معلوم ہوتا تھا کہ وہی وطن ہے۔ دورِ خلافت اور ترکِ موالات میں ملاقاتیوں کی بھرمار، جلسوں جلوسوں کی کثرت اور ہر وقتی شور و شغب سے گھبرا کر وہاں سے وطن آبائی کو منتقل ہو آیا شروع شروع میں جی نہ لگا۔ پھر خوب لگ گیا۔ کام کا موقع سکون و خاموشی کے ساتھ رہتا ہے۔

پڑھنا لکھنا جو کچھ آیا، اس میں بڑا دخل مولانا شبلی کو ہے۔ اُن سے بہت کچھ سیکھا، گویا اولین استاد وہی تھے بعد کو زبان کی حد تک بڑی مدد مرزا محمد ہادی رُسوا لکھنوی سے اور کسی حد تک شمس العلماء مولوی نذیر احمد دہلوی سے ملی۔ باقی تھوڑی بہت خوشہ چینی خدا معلوم کتنے خرمنوں سے اور اب بھی کر رہا ہوں۔ سب کے نام کہاں تک گنا سکتا ہوں۔ اللہ ان سب کو جزائے خیر عطا کرے۔ بہت کچھ گزر چکی، باقی جو رہ گئی ہے وہ گئے دن کی، آناً فاناً گزر جائیگی وقت عزیز جتنا برباد ہو، اس پر قلق و حسرت کس زبان سے کیجئے۔ جب اپنی بداستعدادی، کم عقلی پر نظر جاتی ہے تو خدا جانتا ہے کہ جرت ہلکو کر رہ جاتی ہے اور دنگ و ششدر ہو کر رہ جاتا ہوں کہ اتنا کام بھی کیسے بن پڑ گیا ؎

چہ آرزو کہ ابروئے پُر خم کو دیکھئے
اس حوصلہ کو دیکھئے اور ہم کو دیکھئے

دنیا خوب گذر گئی اور دنیوی نعمتوں سے سرفرازی جی بھر کے رہی اب فکر اسی منزل کی ہے جو سب کو پیش آتی ہے ؎

وقت طلوع دیکھا، وقت غروب دیکھا
اب فکر آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا

اپنے اعمال پر نظر جاتی ہے تو تصویر یاس بن کر رہ جانا پڑتا ہے مگر معاً خیال آ جاتا ہے کہ جس نے اس عالم ناسوت میں قدم قدم پر بے شمار عیبوں کی ستاری کی۔ بغیر کسی حق و استحقاق کے سب کچھ چھپا ڈالا کیا آخرت میں جب اس کی صفت غفاری کا ظہور کامل ہوگا۔ کیا وہ اپنے بندہ کو بے کس اور بے سہارا چھوڑ دے گا تو معاً امید یرس پر غالب ہو جاتی ہے اب تمنا ہے تو صرف اتنی کہ تفسیر کے نئے اڈیشن کی تکمیل اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔

بقیہ صہ مولانا عبد الماجد دریابادی - ذاتی تاثرات

یا جن کے متعلق واقف کرانا چاہتے ہیں، اس طریقہ سے وہ کسی پرچہ پر وہ تمام باتیں نوٹ فرما لیتے ہیں جن کے متعلق مجھ سے گفتگو کرنی ہے اس لئے وہ پسند کرتے ہیں کہ ایسے عزیز مہمان کی آمد کی خبر کچھ دن پہلے سے ہو جائے تاکہ اس سے اطمینان سے گفتگو کرنے کا وقت نکال لیں اور پہلے اس کی تیاری فرمالیں، بعض مرتبہ ایسے عزیزوں سے گفتگو کرنے کے لئے ان کو کئی دن کام کی مقدار اور رفتار بڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ تھوڑا سا وقت اس دن کے لئے خالی کر لیں جس دن ایسے عزیز کو آنا ہے اس لئے کہ مولانا کے یہاں صحیح معنی میں وقت "تیا تُلا" رہتا ہے ہر وقت کے لئے ان کے پاس کام ہے اس لئے محض لوازم مہمانداری اور گفتگو و مذاکرہ کے لئے جب ہی وقت نکل سکتا ہے جب پہلے سے اس کی تیاری ہو جائے اس کی وجہ سے ان کے وقت میں بڑی برکت اور ان کے کاموں میں نہ صرف تنوع بلکہ اس کی مقدار بھی اتنی ہی ہے جو اچھے اچھے کام کرنے والوں کے یہاں نظر نہیں آتی۔ اس بارے میں جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے۔ اس کے امام و پیشوا امام مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تھے جن کو انہوں نے صرف دین ہی کا نہیں دنیا کا بھی حکیم مانا اور اس شعبہ میں اب تو تنہا وہی انکے مقتدیٔ کامل نظر آتے ہیں۔

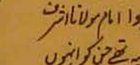

مولانا کے اسلوب تحریر اور ادبی خصوصیات کے متعلق میرا کچھ کہنا تو بے ادبی اور جسارت ہے مگر اتنا ضرور عرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے طرز کے بانی اور خاتم ہیں، طرز نگاری، اسالیب بیان اور اوصافِ ادب میں نازک ترین اور دشوار ترین صنف ہے اس میں وہی ادیب، صاحب قلم کامیاب ہو سکتا ہے جو صحیح معنی میں زبان کے ادا شناس اور مزاج داں ہو، بلکہ اہل زبان ہو کر ذرا سی چوک بے احتیاطی اور بے اعتدالی سے بلکہ بعض اوقات محاوروں کی چاٹ اور زبان کے چٹخارے میں طنز، ہجو، پھکڑ پن اور بے تمیزی کے حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب جیسا مانا ہوا ادیب محاورات کے استعمال کے بڑھے ہوئے شوق میں بعض اوقات موضوع کی ثقاہت اور مقصد کی متانت کو قائم نہ رکھ سکا اور ان مرحوم کی اس کی وجہ سے دوسروں کا ہدف ملامت اور بلا ضرورت اذیت کا بھی سامنا کرنا پڑا قرآن مجید کے ترجمہ اور امہات الامہ کی تبویب وتحریر میں ان سے ایسی ہی فروگذاشتیں ہونے کی وجہ سے مہذب مجلسوں میں ان کے استعمال سے احتیاط برتی جاتی ہے۔ ذرا سی غفلت، بسیار گوئی اور داستان سرائی کے جوش میں آدمی کو خفت اٹھانی پڑتی ہے، ہمارے علم میں مولانا آزاد جنھوں نے لکھنؤ کی ادبی مجلسوں کا لطف بھی اُٹھایا تھا اور زبان کی نوک پلک سے خوب واقف تھے، اس بارہ میں بڑے محتاط تھے۔ مولانا عبد الماجد کی حس اس بارہ میں ذکاوت حس تک پہونچی ہوئی ہے اور زبان کے معاملہ میں ان پر گرفت مشکل ہے۔ بعض مرتبہ ان کا ایک فقرہ ایک شذرہ کا اور ایک شذرہ پوری کتاب کا کام کر جاتا ہے اور کسی وقت ان کا ایک جملہ مخاطب یا مشارٌ الیہ کے لئے ایسا بھی بھاری پڑ جاتا ہے کہ اس کا رکھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے اور اٹھانا بھی بعض مرتبہ وہ کسی پُرانے شاعر کے مصرعہ کو عنوان بنا کر پورا کام کر جاتے ہیں اور وہ مصرعہ سب کچھ کہہ جاتا ہے اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے سب اس کی تشریح اور تفصیل۔ اس موقع پر ان کی ادبیات کے ذخیرہ پر وسیع نظر انکے انتقال ذہنی اور انکے حسنِ انتخاب کی بے اختیار داد دینی پڑتی ہے کہ وہ مصرعہ کہاں سے لائے اور کس طرح اس کو نگینہ کی طرح انگوٹھی میں جڑ دیا۔

مولانا کی تمام ذوقی باتوں، انکے تمام علمی تحقیقات انکے سارے انتقادات سے کلی اتفاق نہ ہو نہ ہر لکھنے پڑھنے والے کے لئے ضروری ہے نہ مولانا کی عظمت و شہرت کے پیشِ نظر ان کے لئے مفید لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنے زمانہ کی نادرۂ روزگار اور صاحب کمال شخصیتوں میں سے ہیں۔ ایک ادیب و صاحب قلم کی حیثیت سے بھی قرآن کے ایک مفسر و خادم کے لحاظ سے بھی، قدیم و جدید کے ایک جامع عالم کے طور پر بھی اور اپنے وقت اور صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے اور فائدہ پہونچانے والے انسان کی حیثیت سے بھی، ایک کہنہ مشق صحافی اور ایک صاحب طرز ناقد و طرز نگار کی بنا پر بھی وہ ہر طرح قابل قدر اور اعزاز کے مستحق ہیں، میں نے ان کے متعلق مدراس کی تعارفی تقریر میں کہا تھا کہ ایک زمانہ آئے گا کہ اس نسل کے لوگ اس پر فخر کریں گے کہ ہم نے مولانا عبد الماجد دریابادی کو دیکھا تھا اور ان کی باتیں سُنی تھیں، اگر ہمارے ملک کی یونیورسٹیوں میں صحیح قدر شناسی اور صحیح معنوں میں بے تعصبی ہوتی تو اُن کو یونیورسٹیوں کی طرف سے ادب فلسفہ اور دینیات میں اعزازی ڈگریاں ڈاکٹریٹ کی پیش کی جاتی ہیں، لیکن یہاں (چند مثالوں کو چھوڑ کر) یہ سب کام سیاسی اور انتظامی مصالح کی بنا پر ہوا کرتے ہیں، اور ان سے اکثر مفادات یا سیاسی فوائد وابستہ سمجھتے ☆☆

☆☆ ہیں مولانا کو خوش قسمتی سے مرکزی حکومت یا صوبائی حکومت کی طرف سے جو کچھ اعزاز و اعتراف حاصل ہوا وہ خود ان کے لئے باعث اعزاز اور انکے حسنِ مذاق اور حسنِ انتخاب کی دلیل ہے مولانا کی عزت و عظمت میں اس سے کوئی اضافہ نہیں ہوا کہ "مادح خورشید مداح خود است"

انشائے ماجد کے مختلف نمونے

حکیم عبد القوی دریابادی

مولانا عبد الماجد دریابادی نے زمانہ طالب علمی ہی سے اوّلاً اخبارات اور پھر رسائل میں مضمون نگاری شروع کر دی تھی اور تصنیف و تالیف و ترجموں کا سلسلہ بھی جلد شروع کر دیا تھا۔ ماشاءاللہ اب ۱۹۷۱ء تک ان کی تصانیف اور مضامین کا ذخیرہ ہزاروں صفحات سے تجاوز ہو چکا ہے۔ ان کی تصانیف اور تحریریں مختلف النوع ہیں اور شروع زمانہ سے اب تک اُن میں بہت کچھ تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ انشائے ماجد مختلف ادوار میں تقسیم کیجا سکتی ہے اور ریسرچ کرنے والے ہر دَور کے منتخب نمونے پیش کر کے ان کی انشاء کی خصوصیات پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ اس مضمون میں اختصار کے ساتھ ان کے مختلف دَوروں کی اور مختلف موضوعات سے متعلق رکھنے والی تحریروں کے خاص خاص نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

فلسفیانہ تحریریں:

مولانا عبد الماجد جس زمانہ میں مسٹر عبد الماجد کہلاتے تھے وہ اپنی فلسفیانہ تحریروں کے لئے مشہور تھے۔ اس دَور کی سب سے مشہور و مقبول کتاب فلسفۂ جذبات انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام شائع ہوئی تھی۔ اس کے دو اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ اس کتاب کا پہلا اڈیشن ۱۹۱۴ء میں نکلا تھا۔ یہ اقتباسات طبع ثانی ۱۹۲۰ء کے ہیں:-

"نپولین اعظم جب پہلی بار گرفتار ہو کر جزیرہ البا میں نظر بند کیا گیا اور کچھ عرصے کے بعد موقع پا کر وہاں سے مفرور ہوا تو اس کے ہمراہ اس کے قدیم سپاہیوں کی ایک مختصر جماعت تھی جو نہ بلحاظ کثرت تعداد نہ بلحاظ آلات جنگ اور بلحاظ سامان رسد وغیرہ اس قابل تھی کہ کسی قوی حریف کا مقابلہ کر سکتی، مگر اس باہمت معزول تاجدار نے اسی کی مدد سے ملک فرانس بلکہ تمام یورپ کے علی الرغم اپنے سابق تخت پر دوبارہ قابض ہوتا جا رہا ہے۔ پہلے ہی معرکہ میں بیس ہزار تازہ دم جوانوں کا سامنا کرنا پڑا۔ موقع ایسا نازک کہ ذاتی شجاعت و تہوّر کا اظہار قطعاً بے سود تھا۔ کوئی دوسرا جنرل ہو تو بدحواس ہو جاتا۔ لیکن نپولین کی عملی نفسیات ذاتی کی داد دینی چاہیے کہ جس وقت دونوں فریق صف آرا ہو گئے وہ تن تنہا اور بالکل غیر مسلح اپنی جماعت سے نکلا اور اس حالت سے بکمال اطمینان فریق مخالف کی صفوں کے سامنے کھڑا ہوا کوٹ کے بٹن تمام کھول کر اپنے سینہ کو برہنہ کر دیا اور ایک پُر اثر لہجہ میں اپنے مخالف سپاہیوں سے جن میں سے اکثر ایک زمانہ میں اس کے ماتحت رہ چکے تھے، خطاب کر کے للکارا کہ،

"تم میں کون وہ سپاہی ہے جو اپنے کے عریاں سینہ پر فیر کرنے کو تیار ہے؟"

اس آواز کا اثر معجزانہ تھا، "کوئی نہیں کوئی نہیں"، کی صدا بلند ہوئی اور اقرار لسانی کی شہادت زبان عمل نے دی کہ معاً تمام سپاہی اپنی جماعت کو چھوڑ، نپولین کے زیر علم آ گئے نپولین جماعات کے اس خاصۂ نفسی سے واقف تھا کہ ان کو مسحور و مسخر کرنے کا راز تین چیزوں میں شامل ہے بسطوت ذاتی (جس کا نپولین بہت بڑا حصہ دار تھا) بلند آواز، اور مؤثر لہجہ۔"

(مقدمہ کتاب صفحہ ۱۶، ۱۷)

دوسرا اقتباس اس فلسفۂ جذبات اصل کتاب کا:-

"ایک اور وجہ متمدن افراد کے زیادہ متاثر ہونے کی یہ ہے کہ چونکہ ان میں عقل، دور اندیشی و پیش بینی زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے بہ نسبت وحشیوں کے وہ نتائج افعال کا اندازہ ان کے وقوع سے بہت پیشتر کر لیتے ہیں اور اس بنا پر یہ بالکل فطری ہے کہ وقوع واقعات سے بہت پیشتر وہ انکے نتائج کا اندازہ کر کے انبساط یا انقباض سے متاثر ہونے لگیں۔ ایک بکری ذبح کرنے کے لئے خریدی جاتی ہے مگر چونکہ وہ اپنی قسمت سے ناواقف ہوتی ہے۔ عین ذبح کے وقت تک اسے کوئی غم نہیں ہوتا بہ خلاف اس کے انسان کی یہ حالت ہے کہ جس وقت سے اُسے پھانسی کا حکم سُنا دیا جاتا ہے وہ اُسی وقت سے گھلنے لگتا ہے۔ اس طرح انسان جوں جوں علم و عقل میں ترقی کرتا جاتا ہے اس کے ساتھ وہ اپنے آلام و لذات دونوں کے اسباب بڑھاتا جاتا ہے اور اکثر حالات میں اصل واقعات غم و مسرت سے زیادہ ان دونوں چیزوں کا تصور زود فرسا یا خوش آئند ہوتا ہے۔ پھر انسان کی محض عقل یا پیش بینی ہی نہیں بلکہ اسکی تمدن زائیدہ صناعیاں و دستکاریاں، ریل، تار، جہاز، ہوائی جہاز اور آلات حرب، جہاں ایک طرف اس کے اسباب راحت و مسرت میں اضافہ کرتے ہیں وہاں دوسری طرف اس کی تکلیف و بربادی کا سامان بھی اپنے اندر رکھتے ہیں۔"

(فلسفۂ جذبات صفحہ ۴۲، ۴۳)

نمونۂ تراجم:

مولانا نے اس دَور میں بعض اہم انگریزی کتابوں کا ترجمہ سلیس اُردو میں کیا تھا جن میں تاریخ اخلاق یورپ (۲ جلد) نے زیادہ شہرت حاصل کی۔ اس کے علاوہ مکالمات برکلے، پیام امن اور تاریخ تمدن حصہ ۲ اور منطق بھی اسی فہرست تراجم میں شامل ہیں۔

تاریخ تمدن:

سر ہنری بکل کی مشہور عام تصنیف ہسٹری آف سولیزیشن کا ترجمہ جو دو جلدوں میں انجمن ترقی اُردو کے زیر اہتمام زیور طبع سے مرصع ہوا۔ کتاب کا بڑا حصہ منشی احمد علی مرحوم بی اے کا کوروی کا ترجمہ کردہ ہے ان کی وفات کے بعد حصہ دوم کے صفحہ ۱۵۷ سے ۳۰۰ تک ترجمہ مولوی عبد الماجد صاحب کا کیا ہوا ہے۔

یہ حصہ ۱۹۱۶ء میں علی گڑھ سے چھپا اس کا صرف ایک نمونہ کافی ہوگا۔

"حقیقت یہ ہے کہ بغیر برک کے تذکرہ کے جارج سوم کے عہد کی تاریخ سرسری طور پر بھی مکمل نہیں کی جا سکتی۔ یہ عجیب و غریب شخص نہ صرف سیاسیات کے اصول و فروع پر حاوی تھا بلکہ کہہ سکتے ہیں کہ جملہ علوم و فنون کی ایک زندہ دائرۃ المعارف تھا۔ اس کے بڑے بڑے نامور معاصرین اُس کے کمالات کی جامعیت کے قائل تھے اور ہمیں تو رابرٹ ہال کا یہ قول حرف بحرف سچ معلوم ہوتا ہے۔

"برک کے کمالات لاتعد و لاتحصیٰ تھے۔ اس کا دماغ عامۃ الورود تھا اور وہ ہر علم و فن سے بہرہ رکھتا تھا۔"

قانون و فنون لطیفہ بظاہر باہم متناقض نظر آتے ہیں لیکن برک کی ذات ان دونوں کی جامع تھی چنانچہ جہاں ایک طرف وکلاء، مقننین کی جماعت اُسے اپنا پیر و مرشد مانتی ہے وہاں دوسری طرف اہل ہنر بھی اُسے اپنا ہادی و رہنما تسلیم کرتے تھے۔ تاریخ و علم الانسان کو ہم بالکل جدید علم سمجھتے ہیں لیکن برک ان علوم میں

امام کا درجہ رکھتا تھا۔ اقتصادیات کا آدم اپنے خیال میں آدم اسمتھ کو سمجھے ہوئے ہیں حالانکہ خود اسمتھ کو اعتراف ہے کہ جب وہ لندن آیا تو یہ دیکھ کر نقش حیرت ہو گیا کہ جن نتائج پر وہ سالہا سال کی مشقت و ریاضت کے بعد پہونچا تھا اور جن نظریات کو وہ تمام تر اپنے اجتہاد فکری کے ثمرات سمجھ رہا تھا، برک وہ سب منازل طے کر چکا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ سائنس کے متعدد اصناف کا بھی پورا عالم تھا اور یہ تمام علوم اُس کے خزانۂ دماغ میں صرف محفوظ ہی نہ تھے بلکہ ایک خاص خوش سلیقگی کے ساتھ مرتب تھے، نظم کی ترتیب اُس کے ذہن کا خاص جوہر تھی، گویا اس کے دماغ میں متعدد خانے تھے اور ہر خانہ میں ایک ایک علم موجود تھا جس سے وہ جب چاہتا کام کے لئے نکال سکتا تھا۔ پھر لطف یہ ہے کہ تدبر، عاقبت اندیشی، عملیت سے گویا اس کا خمیر تھا، باوجود سخت اصولی و فلسفی ہونے کے وہ سیاسیات میں کبھی یہ نہیں کرتا تھا کہ لفظی اصول کے پیچھے عملی ضروریات کا خون کر دے، وہ اس حقیقت کو خوب سمجھے ہوئے تھا کہ سیاسیات کا مقصود حقیقت شناسی نہیں بلکہ مصلحت بینی ہے۔"

(صفحہ ۲۰۴، ۲۰۵)

سیرتی و سوانحی تحریریں:

سیرت و سوانح پر مولانا کی دو کتابیں، حکیم الامت نقوش و تاثرات اور محمد علی۔ ذاتی ڈائری (۲ حصے) خاص طور سے قابل ذکر اور ان کی انشائی خوبیوں کی آئینہ دار ہیں۔ محمد علی حصہ اول شائع شدہ ۱۹۵۴ء کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ تحریک خلافت و ترک موالات کے سلسلہ میں ۱۹۲۱ء میں مولانا محمد علی پر مقدمہ چلا تھا جس کی شہرت سارے ملک میں ہوئی تھی اور بالآخر دو سال کی قید کا سخت حکم سنایا گیا تھا اس کا ذکر:

"نومبر میں حکم سنایا گیا۔ دو برس کی سزا سب ملزموں کے ساتھ محمد علی کو بھی — محمد علی بہت گھوم پھر چکے تھے، مارے مارے پھرتے بہت دن ہو چکے تھے اب مشیت تکوینی کے حاکم کا حکم نافذ ہوا کہ مدت دراز کے لئے ایک جگہ جم کر بیٹھیں ان ہی کی زبان میں سے

دیکھئے اب یہ گردش تقدیر
کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے

اللہ اللہ کیا سماں تھا آکسفورڈ کا گریجویٹ آنرز پایا ہوا گریجویٹ، کامریڈ کا ایڈیٹر، ملک کا ایک معروف ترین لیڈر، چوروں، نقب زنوں، ڈاکوؤں اور خونیوں کے ساتھ قفس میں بند اور جس کے ملنے والا میں ابھی کل تک گورنر اور لفٹننٹ گورنر، راجے اور مہاراجے، ایگزیکیٹو کونسلر اور خود وائسرائے بہادر تھے آج اُس کی عزت جیل کے ادنیٰ پہرہ داروں اور برقندازوں کے رحم و کرم پر تھی، کوچ اور صوفے اور گدّے و قالین کی جگہ زمین کا کھرّا فرش اور غذا وہ مل رہی ہے جو کبھی اس کے چاکروں اور خدمتگاروں نے بھی کیوں کھائی ہو۔

اور یہ سب دعویٰ اسلام کے جرم میں محبت اسلام کی پاداش میں، فرد جرم جو لگی تھی، اس میں آزادی ہند، سوراج کا کہیں نام نہ تھا۔ الزام یہ تھا کہ جو احکام قرآنی اور احادیث رسول قتل مسلم کی وعید میں ہیں ان کو ان کے مسلمان سپاہیوں تک پہونچانے کی کوشش کیوں کی۔ تاریخ ہلکے پیمانے پر سوا تیرہ سو برس کے بعد اپنا اعادہ کر رہی تھی۔ الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ۔ (الحج ع ۶) اور وما نقموا منھم الا ان یومنوا باللہ العزیز الحمید۔ (البروج) اور اسی قسم کی دوسری آیتوں کی تفسیر کا مشاہدہ لفظ و عبارت کی وساطت کے بغیر ہو رہا تھا۔ اُدھر محمد علی جیل گئے اور اِدھر بچے بچے کی زبان پر سے

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی
ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

کا ترانہ آ گیا — جس پر اپنے بیوی بچوں، عزیزوں دوستوں سے دو چار دن کی بھی جدائی شاق تھی اُسے حکم ۲۴ مہینوں تک سب سے الگ قید فرنگ میں بند رہنے کا ملا — اللہ اللہ کیا شان بے نیازی ہے اپنے عاشقوں کے امتحان کیسے کیسے کرائے جاتے ہیں۔

(صفحہ ۱۰۲، ۱۰۴)

"سچ" اور "صدق" کے اقتباسات:

مولانا دریابادی کا ہفتہ وار اوّلاً سچ کے نام سے ۱۹۲۵ء سے لے کر ۱۹۳۳ء تک نکلتا رہا۔ پھر یہی اخبار صدق کے نام سے نکلا۔ دسمبر ۱۹۵۰ء سے یہی اخبار "صدق جدید" کے نام سے تا اینوم نکل رہا ہے۔ ان تینوں اخباروں کے پہلے صفحہ کی سچی باتیں، شذرات، مقالے اور کتابوں پر تبصرے تمام تر مولانا ہی کے قلم کے رہین منت ہوتے تھے اور علاوہ معنوی مقصد اصلاح کے وہ ان کی فنکارانہ انشاء پردازی کے بھی آئینہ دار ہیں۔

ان کے ایک مقالہ انقلاب کا جارو(جون ۱۹۳۱ء) کے ابتدائی دو پیراگراف ملاحظہ ہوں:۔

"اگر آپ کا تعلق اونچے طبقے سے ہے تو کسی "سرا" میں ٹھہرنا آپ کے لئے باعث توہین، لیکن کسی ہوٹل میں قیام کرنا ذرا بھی باعث شرم نہیں — حالانکہ دونوں میں کیا فرق بجز اس کے ہے کہ "سرا" مشرقی ہے دیسی ہے اور ہوٹل مغربی ہے، انگریزی ولایتی ہے۔ کوئی اگر یہ کہہ دے سرا کے فلاں "بھٹیارے" سے آپ سے یارانہ ہے۔ تو آپ اس کا منہ نوچ لینے کو تیار ہو جائیں لیکن فلاں "ہوٹل کے منیجر" سے آپ سے بڑا ربط ضبط ہے۔ آپ اسے فخریہ تسلیم کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ "سرا" کے بھٹیارے اور "ہوٹل کے منیجر" کے درمیان بجز ایک کے دیسی اور دوسرے کے ولایتی ہونے کے اور کوئی فرق ہے؟ کسی مدرسہ میں اگر آپ مدرس ہیں تو آپ حقیر ہیں، ذلیل ہیں لیکن کسی کالج میں اگر آپ لکچرر یا پروفیسر ہیں تو معزز ہیں، صاحب وجاہت ہیں حالانکہ اپنے اصل مفہوم کے اعتبار سے مدرس اور پروفیسر، بالکل ایک چیز ہیں۔ ندوہ کے "دارالاقامہ" میں اگر آپ قیام پذیر ہیں تو آپ کا دل خوش نہیں ہوتا، لیکن اسی دارالاقامہ کا نام جب آپ "شبلی ہوسٹل" سنتے ہیں تو آپ کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگتا ہے — "مدرسہ" میں اگر آپ پڑھتے ہیں یا پڑھاتے ہیں تو خود اپنی نظروں میں آپ ذلیل و خوار ہیں لیکن اگر آپ کا تعلق کسی "کالج" سے ہے تو پھر آپ سے زیادہ معزز کون ہے؟ وہ دن گئے جب زبانوں پر "مدرسہ چشمۂ رحمت" کا تذکرہ تھا، اب وہ "چشمۂ رحمت کالج" ہے اور وہاں کے "صدر مدرس" "پرنسپل" صاحب ہیں۔ فرنگی محل کے مدرسہ نظامیہ کے سب سے بڑے اُستاد کو "صدر مدرس" ذرا کہہ کر تو دیکھ لیجئے فوراً آپ کی غلطی کی تصحیح کی جا رہی ہے کہ ان کا عہدہ اب صدر مدرس کا نہیں پرنسپل کا ہے۔"

"سچی باتیں" کا ایک نمونہ "سچ" (لکھنؤ) ۱۹۲۸ء سے منقول:

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کے نزدیک شہروں کا پسندیدہ ترین حصہ وہاں کی مسجدیں ہیں اور ناگوار ترین حصہ وہاں کے بازار ہوتے ہیں۔"

آپ نے شاید کس کا ارشاد ہے؟ اس کا جسے ہم اور آپ اپنی زبان سے سب سے بڑا رہبر اور سب سے بڑا معلم تسلیم کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے، اشارہ کنایہ میں نہیں صاف اور کھلے لفظوں میں ارشاد ہوتا ہے کہ شہروں کا پیدا کرنے والے کی نظر میں وہاں کا محبوب ترین اور بہترین حصہ کیا ہوتا ہے؟ مسجدیں اور ناگوار ترین حصہ کون سا ہوتا ہے، وہاں کے بازار۔

یہ رسولؐ کا قول تھا، امت کا عمل کیا ہے؟ آج ہم کو آزادی کا ہر حصہ، شہر کی ہر عمارت، مسجد سے زیادہ عزیز ہے۔ چوک کے کوٹھوں کی آبادی ہمارے دم سے قائم ہے۔ تھیٹروں کی سرپرستی ہمارے ذمہ، سینما اور سرکس دیکھنے والوں میں ہم سب سے پیش پیش میلے ٹھیلوں کی چہل پہل ہماری ذات سے وابستہ، پارک کی سیر ہم کو عزیز، کلب کی حاضری میں ناغہ ہم نہیں کرتے مشاعروں کی شرکت ہمارے لئے فرض عین۔ گھوڑ دوڑ کے میدان ہمارے دم سے آباد، فٹ بال میچ اور ہاکی میچ شاید ہی ہم سے کبھی چھوٹتا ہو، ہوٹل ہم کو عزیز، نمائش گاہیں ہم کو عزیز، بال روڈ ہم کو عزیز، چاندنی چوک ہم کو عزیز، ایڈورڈ پارک ہم کو عزیز، مال روڈ ہم کو عزیز، حسین ساگر ہم کو عزیز، اپالو بندر ہم کو عزیز۔۔ چوپاٹی ہم کو عزیز، ایڈنس گارڈن ہم کو عزیز، نخاس ہم کو عزیز، حضرت گنج ہم کو عزیز، چار مینار ہم کو عزیز، سودے والوں کی صدائیں ہم کو عزیز، کھانے کی دکانوں کی خوشبوئیں ہم کو عزیز، شربت والوں کے گلاس ہم کو عزیز، آئس کریم کی پلیٹیں ہم کو عزیز اور خیر یہ تو عوام کا ذکر تھا، کتب خانے ہمارے "خواص" کو عزیز، کونسل چیمبر ہمارے "ممبروں" کو عزیز، لکچر ہال اور جلسہ گاہیں ہمارے لیڈروں کو عزیز، مدرسے اور بورڈنگ کی عمارتیں ہمارے قومی کارکنوں کو عزیز، غرض سب کو اللہ کے گھر کے سوا اور سب کچھ عزیز، اللہ کی توحید کا کلمہ پڑھنے والو، اپنے دلوں کو ٹٹولو، فی صدی نہیں فی ہزار بلکہ فی لاکھ ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جنھیں مسجد دل سے عزیز ہے جن کے دل مسجد میں راحت پاتے ہیں؟"

صدق جدید کے شذرات (نوٹوں) کا نمونہ۔

نوٹ کا عنوان "بے پناہ جنسی ہیجان" ہے جو صدق جدید ۱۰ مارچ ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں نکلا ہے:۔

"واشنگٹن ۲۶ جنوری۔ آج ایوان صدر میں ایک پریس کانفرنس کے دوران ایک لیڈی رپورٹر نے صدر سے مارشل لا کا مطالبہ کر کے صدر جانسن کو کچھ دیر کے لئے حیرانی میں ڈال دیا۔ لیڈی رپورٹر نے کہا کہ ملک میں جنسی جرائم کی کثرت ناقابل برداشت ہو گئی ہے زنا بالجبر کی وہ شدت علانیہ ہو گئی کہ اب ضرورت ہے کہ اس کی روک تھام کے لئے مارشل لاء سے کام لیا جائے۔"

گویا پولیس تھک کر مایوس ہو گئی، عدالتیں ناکام ہو چکیں، جیل خانے ناکافی ثابت ہو چکے، اب ضرورت اس کی ہے کہ مجرموں کو گولی سے اڑا دیا جائے۔

اور یہ مطالبہ وہاں شروع ہو گیا ہے جہاں حرام کاروں کے لئے تازیانہ اور سنگساری کی سزا پسماندہ ذہنیت کی نشانی اور وحشت و بربریت کی دلیل ہے۔

بہتر ہے مغرب کے دانشورو، اسلام کے تصور عفت و عصمت کی خوب ہنسی اڑاؤ، اسلامی احکام حیا و حجاب کے ساتھ جی بھر کر تمسخر کرو۔ شراب پی پی کر اپنے معاشرے کو زنا پسندی کے سیلاب میں غرق کر دو، اپنے افسانوں، ناولوں، اخباروں، رسالوں، ناٹکوں، کھیل تماشوں، تصویروں، مجسموں ہر راستہ سے ہیجان شہوت اور تلاطم نفس پرستی برپا کر دو اور جب اپنے ہاتھوں کے لائے ہوئے ہولناک طوفان کی پوری زد اپنی ہی بہنوں اور بیٹیوں، ماؤں اور بہوؤں پر پڑنے لگے اور جو بایوں اور انسانوں کے درمیان حیا و غیرت کے لحاظ سے کوئی فرق نہ رہ جائے تو بے تحاشہ گولیاں چلانے اور مارشل کے لئے غل مچانے لگو۔

ادبی مضامین:

مولانا کے ادبی مضامین، مرزا رسوا کے قصے، کچھ ادھر سے کچھ اُدھر سے اُردو کا واعظ شاعر اُردو کا ایک بدنام شاعر، پریم چند وغیرہ۔ اُردو اخبارات و رسائل میں اور پھر مجموعہ مقالات میں شائع ہو کر خوب مقبول ہو چکے ہیں۔ ایک ادبی مضمون "نیا آئین اکبری" جو ۱۹۲۳ء میں پہلی بار ایک ادبی جلسہ میں پڑھ کر سنایا گیا تھا، کا تمہیدی حصہ ملاحظہ ہو۔

"آئین اکبری" تو وہی ایک ہے سب کا جانا ہوا، شہنشاہ اکبر کے انتظامی خط و خال کا آئینہ، اب اس میں کوئی جدت کیا پیدا کریگا، پرانے کو نیا کیونکر بنائے گا اور اطلس میں گزی کا ٹاٹ کا پیوند کوئی کہاں سے لگائیگا؟ لیکن اکبر اکیلے ایک شہنشاہ ہند ہی کا تو نام نہیں ہوا ہے، اقلیم سخن کا بھی ایک تاجدار اسی نام کا گزرا ہے، صدیوں قبل نہیں، حال ہی اور کہیں بہت دور نہیں آپکے شہر سے نزدیک الہ آباد میں۔ وہ قدیم آئین اکبری تھا، اقلیم ہند کے ایک فرمانروا کا کروفر جلال، یہ آج کا جدید آئین اکبری ہے اقلیم معانی کے ایک تاجدار کا پرتو جمال۔ البتہ وہاں داستان گو تھا ایک نامور کا ابوالفضل اور یہاں عرض پرداز ہے ایک سراپا جہل — خیر نمائش کے عجائب زار میں ایک عجوبہ کا اضافہ ہی سہی، ادبی کانفرنس میں ادیبوں اور شاعروں کے مجمع میں کسی گروں اور سخن فہموں کے جلسہ میں ایک کم سواد قصباتی کی جسارت اللہ اکبر، بس یہ سمجھئے کہ گھوڑ دوڑ کے میدان میں جہاں بازیاں بڑے بڑے شہسواروں کی لگ رہی ہیں وہیں ایک گوشہ میں ایک نعل بند بھی کیل کانٹے سے لیس اپنا تھیلا لئے موجود۔

ظرافت کلام اقبال کی سب سے بڑی نقیب بھی رہی ہے اور کمال اکبر کے حق میں سب سے گہری نقاب بھی۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ اکبر کے نام کو نہقہوں نے اُچھالا، اُن کی شہرت کو تالیوں نے چمکایا۔ لیکن یہ بھی اسی قدر صحیح کہ دنیا انھیں محض ایک دل لگی باز سمجھ کر ان کے لطیفوں پر ٹوٹی رہی، ان کی شوخیوں پر ہنستی مسکراتی، انکے چٹکلوں پر لوٹتی کھلکھلاتی رہ گئی اور نظر کسی کی نہ گئی اور کسی ایک آدھ کی گئی تو وہ شمار میں نہیں کہ جس ساز سے یہ نغمے نکل رہے ہیں وہ خود کتنے سوز میں ڈوبا ہوا ہے۔"

مذہبی اور قرآنی مضامین:

ادب کے ساتھ مولانا کا دوسرا اہم اور خاص موضوع مذہب خصوصاً قرآنیات ہے۔ ان کی تفسیر ماجدی کا پہلا اور مختصر اڈیشن تاج کمپنی کراچی کے زیر اہتمام عرصہ ہوا شائع ہوا تھا، اب دوسرا ضخیم تر اڈیشن مکمل نظرثانی اور بہت کچھ ترمیم و اضافہ کے بعد ہندوستان سے شائع ہو رہا ہے دوسری جلد جس میں دسویں پارے تک کی تفسیر آ گئی ہے۔ چند ماہ ہوئے شائع ہوئی ہے اس کے بعد اور ان کے قرآنی مضامین پر مستقل رسائل کی انشاء انکے ادبی مضامین اور صحافتی تحریروں سے خاصی مختلف ہونے کے ساتھ حد درجہ سلیس اور بآسانی ذہن نشین ہونے والی ہے۔ تفسیر کا ایک نمونہ اس سلسلہ میں ملاحظہ ہو۔ سورہ فاتحہ میں رب العالمین پر تفسیری نوٹ کا ایک ٹکڑا۔

"رب العالمین کا لفظ لا کر قرآن مجید نے گویا بتا دیا کہ ہر صنف موجودات کا ایک مستقل نظام تربیت ہے اور سب کا آخری سرا اسی قادر مطلق، واحد و یکتا کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی بھی صنف موجودات اس کے ہمہ گیر نظام ربوبیت سے آزاد و مستثنیٰ نہیں۔

یہ تعلیم بھی اس ایک لفظ سے مل گئی کہ اسلام کا خدا کسی مخصوص نسل، مخصوص قوم، مخصوص قبیلہ کا خدا نہیں — یہ حقیقت تاریخ مذاہب میں نہایت درجہ اہمیت رکھتی ہے، اسلام سے قبل مذاہب جس صورت میں موجود تھے وہ اس وسیع تخیل ہی سے آشنا نہیں رہے تھے، ہر قوم خدا کو صرف اپنا خدا تسلیم کرتی تھی گو خدا کی حیثیت محض قومی خدا کی رہ گئی تھی، بابل، مصر، ہند، یونان، روم، عرب وغیرہ کی مشرک قوموں کا ذکر نہیں، بنی اسرائیل جیسی موحد[عہ]

بقیہ صف: مولانا عبدالماجد کی تنقیدی بصیرت

حقائق کو نظر انداز نہیں کرتی، اور جہاں تک ادب کا تعلق ہے اس کے اخلاقی پہلوؤں پر زور دیتے ہوئے بھی تخلیق کے ادبی جمالیاتی حسن پر بھرپور نگاہ ڈالتی ہے اسکی بہت اچھی مثال مرزا شوق کی زہر عشق اور مرزا ہادی رسوا کی امراؤ جان ادا پر ان کے خیالات ہیں۔ دونوں تخلیقات کے موضوع وہ نہیں ہیں جن کی طرف مولانا عبدالماجد پسندیدگی کی نظر ڈالیں لیکن جب انکے فنی اور ادبی محاسن کے ساتھ انصاف کرنے کا وقت آیا تو انہوں نے بخل سے کام نہیں لیا اور ان پہلوؤں کی داد دی جس کی وہ بجا طور پر مستحق تھیں یہ ضرور ہے کہ اپنے مذہبی تصورات، اخلاقی عقائد اور تہذیبی افکار کی وجہ سے انہوں نے تحسین شناسی کے لئے وہ زبان استعمال کی جو عام طور سے تنقید میں استعمال نہیں کی جاتی۔ مثلاً زہر عشق کے ایک درد انگیز منظر سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں:۔

"نواب مرزا تجھ پر رحمت، تیری روح پر رحمت کہ تیری نوک اجڑنے والی ماں کے منھ سے یہ بول نکل رہے ہیں یا دل جگر کے ٹکڑے کٹ کٹ کر آنکھ اور زبان کی راہ سے خارج ہو رہے ہیں۔"

پھر مضمون کے خاتمہ پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں:۔

"مشرق کے بدنام سخن گو، اُردو کے بدنام شاعر رخصت! تو درد بھرا دل رکھتا تھا تیری یاد بھی اردو والوں کے دلوں میں زندہ رہے گی، تو نے موت کو یاد رکھا تیرے نام پر بھی موت نہ آنے پائے گی۔ تو نے غفلتوں اور سرمستیوں کی داستان کو خوب پھیلایا شاید کسی رحمت بے حساب پر نگہ گئے لیکن انھیں غافلوں اور سرمستیوں کو موت و انجام کی یاد دلا کر خوب رُلایا۔۔۔۔"

مرزا رسوا کی صلاحیتوں اور خوبیوں کا ذکر تو مولانا عبدالماجد کی زبان پر بہت اور عقیدت کے ساتھ آیا ہی تھا لیکن جب انکی ناول نگاری کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو انکا قلم وجد میں رقص کرنے لگتا ہے:۔۔۔۔

"اردو میں ناول بہتوں نے لکھے پر انکا رنگ سب سے الگ، ان کا انداز سب سے جدا۔ نہ انکے پلاٹ میں "سنسنی خیزیاں" نہ انکی زبان میں "عبارت آرائیاں" نہ انکے اوراق میں "برق پیمائیاں" اور نہ "کوہ تراشیاں" نہ ان کے الفاظ "ترنم ریز" نہ ان کی ترکیبیں "ارتعاش انگیز" نہ ان کی تصویر رزم میں "برق پاشیاں" نہ انکی داستان بزم میں "اتمام آرائیاں" نہ ٹھاٹ وہی روز مرہ صبح و شام کے پیش آنیوالے واقعات جو ہم آپ سب دیکھتے ہوں، زبان وہی گھر اور باہر کی گفتگو اور ٹکسالی بول چال جو ہم آپ سب بولتے ہیں۔ قصے کے مقامات نہ لندن نہ ماسکو نہ برلن نہ ٹوکیو۔ بس یہی لکھنؤ، فیض آباد، دہلی، الہ آباد۔ افسانے کے اشخاص نہ لدھور نہ سندباد، نہ تاج الملوک نہ ملکہ زرنگار، بس یہی حکیم صاحب، راجہ صاحب اور نواب صاحب، میر صاحب اور مرزا صاحب، عسکری بیگم اور عمدہ خانم، امراؤ جان اور بوا ایک قدم کہتے ہیں کہ صاحب کمال لاولد رہ جاتا ہے۔ اسکی نسل آگے نہیں چلتی اپنے طرز کا موجد بھی وہی ہوتا ہے اور خاتم بھی وہی مرزا رسوا کا بھی خلف معنوی آج تک پیدا نہ ہوا۔"

یہ چند جملے مثال کے طور پر ایسی تخلیقات سے دئے گئے ہیں کہ یہیں ان کے ذوق ادب کی آزمائش تھی ورنہ اکبر یا حالی مولانا محمد علی یا نظیر اکبرآبادی پر اظہار خیال کرتے ہوئے تو ان کے نقطہ نظر کا اندازہ لگا لینا کچھ ایسا مشکل نہیں رہ جاتا۔ خاص سے اکبر الہ آبادی، مولانا محمد علی کا ذکر آ جائے تو تنقید اور عقیدت مندی کی حدیں ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں اس کی وجہ بھی ہے کہ ان حضرات کے افکار و خیالات سے صرف انکا فکر ہی ہم آہنگ نہیں ہے بلکہ جوش بھی انکا ساتھ دیتا ہے۔ مولانا عبدالماجد عربی اور فارسی کے عالم ہیں فلسفہ اور نفسیات کے ادق مسائل سے اچھی طرح واقف ہیں لیکن ان کے اسلوب میں دشوار پسندی اور غرابت بیان کا شائبہ بھی نہیں۔ اخباروں کی خبروں پر حاشیہ آرائی ہو کسی "بڑے آدمی" پر نکتہ چینی ہو کسی کانفرنس کا اجتماع کے لئے چند سطروں کا پیام ہو کسی مشہور ادیب کی تخلیق پر تبصرہ ہو کوئی معمولی ادبی لطیفہ یا چٹکلا ہو مولانا کے قلم سے چھوکر رنگین اور شگفتہ بن جاتا ہے اسلوب کی یہی ادبیت ہے جو کسی منزل پر ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی، معاصرانہ چشمکوں میں یہی اسلوب اپنی سادگی اور وقار کے ساتھ تیر و نشتر بنتا ہے اور تعزیت کے پیغاموں میں آنسو اور درد، سفرناموں اور ڈائریوں میں اسی سے مصوری ہوتی ہے اور مذہبی مقالات میں عقیدے کی گرمی سے توانائی پیدا ہوئی ہے۔

مختصر یہ کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی جو تنقیدی نظر ریاضت سے ہاتھ آئی ہے اسی میں مطالعہ، ذہانت، ذوق سلیم قدرتی اور صحیح ادبی مزاج کی آمیزش نے ایسی انفرادی شان پیدا کی ہے جسے تحقیقی تنقید کے دائرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ بہت سے دوسرے علمی کاموں سے قطع نظر مولانا دریابادی اپنے ادبی اسلوب کی وجہ سے بھی زندہ رہیں گے۔!!

[عہ] قوم بھی خدا کو خدائے کائنات ہونے کی پوری طرح قائل نہیں رہ گئی تھی۔ قرآن نے ایک لفظ رب العالمین لا کر ان سب مشرکانہ و گمراہانہ عقائد کی تردید کر دی، مشرک قوموں کو سب زیادہ ٹھوکر صفت ربوبیت ہی کے سمجھنے میں لگی ہے اسلئے قرآن مجید نے تعلیم توحید میں بھی اسی کو مقدم رکھا۔"

آہ! مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

معارف کے شمارہ کی کتابت ہو چکی تھی کہ نمودروزگار، یگانۂ وقت، مجاہد العلم، رئیس القلم اور دارالمصنفین کی مجلس ارکان کے صدر نشین مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی رحلت کی اچانک خبر ریڈیو سے سنی تو۔ ع
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے
ان کی زندگی کی شاندار کتاب ختم ہو گئی، جس کا ہر ورق اپنی گوناگوں خوبیوں سے مزین رہا، یہ عاجز راقم گزشتہ ۴۰ سال سے ایک ادنیٰ خورد کی حیثیت سے ان کی بزرگانہ شفقت اور علمی جلالت کے سامنے سرِ خم تسلیم کرتا رہا، اس مدت میں ان کی زندگی کی جو سرگرمیاں رہیں وہ متحرک تصویروں کی طرح نظروں کے سامنے گھومنے لگیں۔

گل دآئینہ کیا، خورشید و مہ کیا
جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رو تھا

کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔اے کرنے کے بعد ان کی زندگی کا آغاز الحاد و بے دینی کی وادی کی سیر سے ہوا، مگر یہیں ان کی نظر شعلۂ طور بن کر چمکی، جس کے بعد وہ توحید اور رسالت کے ایسے داعی اور مبلغ بنے کہ سند یافتہ عالم نہ ہونے کے باوجود باوقار عالم تسلیم کئے گئے، اچھے اچھے علماء ان کے سامنے جھکے، کبھی علماء کی مجلس کے سرخیل بھی منتخب ہوئے اور ان کا خاتمہ بالخیر کلام پاک کے مفسر اور شارح کی حیثیت سے ہوا، انہوں نے اردو اور انگریزی میں جو تفسیر لکھی ہے اس میں اسرائیلیات کی فتنہ سامانیوں اور توریت و انجیل کی تحریفات کی خبر انگیزیوں کی راز کشائی میں جو دیدہ وری اور نکتہ دری دکھائی ہے اس سے کلام پاک کے مفسروں میں اُن کا مقام ہمیشہ نمایاں رہیگا ان کی یہ تفسیر گنجینۂ معارف و تحقیق بھی سمجھی جاتی رہے گی۔

وہ کچھ دنوں تک فلسفی بھی رہے، انکی فلسفۂ جذبات اور فلسفۂ اجتماع انکی ابتدائی دور کی تصانیف ہیں، جن کے بعد انکی مبادی فلسفہ کی دو جلدیں فلسفہ اور اس کی تعلیم ہم اور آپ بھی نکلیں۔ ان کے فلسفیانہ مضامین کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا، اور جب اردو کا خالی دامن ان کے فلسفیانہ خیالات سے پُر ہو رہا تھا تو انہوں نے فلسفہ کے چناں و چنیں سے منہ موڑ کر اقبال ہی کی طرح پیر روم کو اپنا معنوی مرشد قرار دیا، اسلامی تصوف اور فیہ مافیہ لکھ کر راہ سلوک کے ایک پُرجوش سالک بن گئے۔ مولانا حسین احمد مدنی سے بیعت بھی ہوئے مگر حکیم الامت لکھ کر مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تعلیمات کے اسرار و رموز کے شارح بنے جس کے بعد۔ ع
جس طرف کو لے چلا رہبر چلے

وہ بڑے اچھے مترجم بھی تھے انگریزی سے اردو میں برکلے کے مکالمات، لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ، بکل کی تاریخ تمدن، سیوپال کی پیام امن کے ترجمے کیے، انکے ترجمے میں اصل کتاب ہی کی لذت اور کیفیت محسوس ہوتی ہے، ان کتابوں سے یورپ کے تہذیب و تمدن سے واقف ہوئے تو ان سے متاثر ہونے کے بجائے انکو یاجوجی تمدن اور دجالی فتنہ قرار دیا، وہاں کی فحاشی، عریانی، رندی اور بے راہ روی پر اپنی مختلف تحریروں سے ایسی کاری ضرب لگاتے رہے کہ جن لوگوں نے ہندوستان کو یورپ کی تمدنی فریب کاریوں سے بچایا ہے ان میں ان کا نام بھی نمایاں طور پر لیا جائے گا۔

وہ اُردو تنقید نگاری کے خاص رنگ کے امام بھی رہے، اردو شعر و ادب کی رمز شناسی میں ان سے شاید ہی کوئی سبقت لے جاسکا، لکھنوی تہذیب کے ساتھ لکھنؤ کی شاعری اور اس کے نثری اسلوب کے بڑے دلدادہ تھے، زہر عشق، مرزا رسوا اور گل بکاؤلی پر انکے تبصرے ان کے نقادانہ دقتِ نظر کے شاہکار ہیں، غالب کو ایک فلسفی کے بجائے ہر بات کو حکیمانہ انداز میں کہنے والا شاعر، مرزا شوق کو ایک بدنام شاعر، حالی کو ایک واعظ شاعر، اکبر الہ آبادی کی شوخی اور دل لگی کو ایک نیا آئین اکبری، شکوہ والے اقبال کو صاحب حال اور سالک اور جواب شکوہ کے اقبال کو صاحب مقام اور عارف کہہ کر نقادوں کے ذہن کے لئے نئے دریچے کھول دیے۔

وہ اپنے زمانہ میں اردو کی انشاء پردازی کے بھی امام رہے، وہ اپنے طرز کے موجد اور خاتم تھے، شبلی، مہدی افادی اور سید سلیمان ندوی کے انداز بیان کے بڑے پرستار اور قدر داں تھے مگر اپنے طرز نگارش میں کسی کی تقلید پسند نہیں کی، بالکل منفرد اور غیر مقلد رہے، ان کی تحریروں میں جہاں ندیٔ صہبا، موج خرام یار، نکہت باد بہاری، اور فکری لالہ کاری ملے گی وہاں بچھو حریفوں کے مقابلہ میں سانپ کی پھنکار، بچھو کا ڈنک اور خنجر کا وار بھی ہے، وہ اپنے مخالفوں کے خلاف اپنے قلم سے صف شکن یلغار اور مردانگی یورش کر کے اپنی انشاء پردازی کا جوہر دکھاتے، اپنے عزیز دوستوں اور محبوب معاصروں کی موت پر ماتم کرتے تو اس میں دلسوزی، عقیدتمندی اور وفا کیشی کے ساتھ ان کے قلم کی رعنائی، شگفتگی اور رنگینی پوری بہار آفریں قوس قزح نظر آتی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا عبدالماجد بدایونی، بہادر یار جنگ، سید سلیمان ندوی اور حکیم عبدالحمید لکھنوی پر ان کی ماتمی تحریروں میں انکے زور بیان کے ساتھ اثر، تاثیر اخلاص محبت اور درد کے جھلملاتے جواہر ریزے نظر آتے ہیں، ان کے مضامین کے مجموعے انشائے ماجدی میں جمع کردیے گئے ہیں جو ہر زمانہ میں بلاغت کی سحرکاری، فصاحت کی تازگی اور سلاست کی پرکاری کے لحاظ سے اردو ادب کے شہ پارے بنے رہیں گے، یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ لکھنؤ کی زبان کا بانکپن اور سیلاپن دکھانے والا سفر حجاز اور تفسیر کی زبان لکھنے میں کس قدر باوقار، باوزن اور متین ہو گیا ہے۔

انہوں نے "سچ" اور "صدق" نکال کر اپنے کو شیر دل بلکہ کفن بر دوش صحافی بھی ثابت کیا، حکومت کا دبدبہ، قانون کا شکنجہ، انقلاب کا کوئی بھچکولا ان کے قلم کی آزادی کو نہ روک سکا، مسلمانوں کے غمخوار، غمگسار اور دمساز بن کر ان کے سیاسی المناک حوادث پر خون کے آنسو روئے، ان کی سیاسی کامیابی اور فتح پر اپنی مسرت و شادمانی کا اظہار دل کھول کر کیا، خواہ ان کی یہ تحریریں حکومت کی پالیسی کے خلاف ہی کیوں نہ ہوتیں، "سچ" اور "صدق جدید" میں سچی باتیں لکھ کر ایمان، ایقان اور عرفان کے موتی بکھیرتے رہے اس انداز کی تحریر اب مدت مدید تک کوئی اور نہ لکھ سکے گا، اسی کے ساتھ اسلامی طرز فکر کی راہ چھوڑنے والوں کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں اُترتے، کردار کو نیلام کی بولی پر بھینٹ چڑھانے والوں کے نہاں خانے میں پہونچ کر شبخوں مارتے، اپنی تحریروں کی ناوک فگنی سے تجدد پسندوں کے کلیجوں کو چھلنی کرتے رہے، ان کے اخبار کا ایک شذرہ، ایک جلی سُرخی، ایک زہریلا فقرہ انکے حریفوں کے پورے مضمون پر بھاری ہوتا۔

ان کا چھوٹے سائز کا ہفتہ وار اخبار "سچ" یا "صدق جدید" کل آٹھ صفحے پر مشتمل ہوتا، اس کو شروع سے آخر تک خود ہی لکھتے جو ان کے قلم کی صاعقہ پاشی کی دلیل ہوتی، اس میں کبھی تو واعظ، کبھی فقیہ، کبھی مجتہد، کبھی مرد مومن، کبھی مفسر قرآن، کبھی متکلم اسلام، کبھی نقاد، کبھی سیاسی مبصر اور یہاں کبھی علم کے افراسیاب، کبھی اسلوب کے جمشید اور کبھی زور بیان کے رستم بن جاتے، وہ اپنی آخر عمر میں خوش ہوں گے کہ علم، ادب اور فن کا ایک انبار نہیں بلکہ گل و گلزار لگا کر زندگی ختم کر رہے ہیں۔

وہ خلافت تحریک میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا محمد علیؒ کے اصرار سے شریک ہوئے، مگر کبھی سیاسی رہنما ہونے کے دعویدار نہیں ہوئے، البتہ علی برادران کی طرح جو کھدر کا کرتہ اور پائجامہ اور چغہ پہنا تو آخر عمر تک پہنتے رہے، مولانا محمد علی کے نام پر جان چھڑکتے رہے، ان کی یاد میں محمد علی کی ڈائری کے نام سے جو دو جلدیں

لکھی ہیں، ان میں ان کے نہ صرف دل و جگر کے ٹکڑے بلکہ انشاء پردازانہ کمالات کے سارے جلوے نظر آتے ہیں۔ مولانا محمد علی پر ان دونوں جلدوں سے بہتر اب تک کوئی اور کتاب نہیں لکھی گئی۔

دارالمصنفین کی ۶۱ سالہ زندگی کے ہر نشیب و فراز میں اس کے ہمدم اور ہمراز بنے رہے، شروع میں اس کی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے، پھر اس کی مجلس ارکان کے صدر بھی ہو گئے، اس کا شاید ہی کوئی ایسا جلسہ ہوا ہو جس میں ان کی شرکت نہ ہوئی ہو، آخری بار گذشتہ نومبر میں ان کی علالت کے زمانہ میں ملنے گیا تو رخصت کرتے وقت فرمایا کہ خدا کرے دارالمصنفین کے آئندہ جلسہ میں پھر حاضری کا موقع مل جائے، وہ یہاں تشریف لاتے تو تمام لوگ ان کے سامنے مؤدب بیٹھتے، سید صاحب سے وہ عمر میں بہت چھوٹے تھے، مگر وہ ان کا بڑا احترام کرتے، ان کو کوئی خط لکھتے تو اس احترام کو برقرار رکھتے خود وہ سید صاحب کی بڑی عزت بلکہ ان سے بڑی محبت کرتے، جب کبھی ان پر کوئی مضمون لکھا، اُن کا قلم بہت ہی رواں اور شگفتہ ہو گیا، مولوی مسعود علی ندوی سے ان کی بڑی بے تکلفی رہتی، وہ طبعاً بہت ہی متین، سنجیدہ اور خاموش تھے، کسی مجلس میں مشکل سے کچھ بولتے، مگر مولوی مسعود علی ندوی سے باتیں کرتے تو عندلیب شیوا بیان بن جاتے، صدق میں ان سے کسی سے قلمی جنگ شروع ہو جاتی تو سید صاحب فرماتے کہ ان کے گوریلا جنگ کے خلاف کسی کا کامیاب ہونا آسان نہیں، سید صاحب کے بعد وہ دارالمصنفین کے علمی محتسب بھی بن گئے تھے۔ معارف اور یہاں کی نئی تصانیف ان کی خدمت میں ضرور بھیجی جاتیں، زبان اور انداز بیان میں کوئی فروگذاشت ہو جاتی تو اسکی طرف توجہ ضرور دلاتے اور جو چیز پسند آجاتی اس کی تعریف دل کھول کر کرتے۔ افسوس دارالمصنفین اپنے ایک بڑے علمی محتسب سے محروم ہو گیا۔

ان تمام اوصاف کے ساتھ ان کا ایک بہت بڑا وصف یہ بھی تھا کہ انہوں نے بڑی جرأت کے ساتھ اسلامی حمیت کی دیدبانی، اسلامی شعار کی پاسبانی، اور ملی غیرت کی رجز خوانی کی، انکی تفسیر کے ساتھ ان کا وہ سوز نہاں اور درد پنہاں جو ان کے دل میں اسلام کے لئے رہا ان کا توشۂ آخرت بنے گا، ان ہی کی بدولت جنت کے رضوان نے ان کا خیر مقدم کیا ہو گا اور حوریں پیشوائی میں شراب طہور کا مینا و ساغر لے کر بڑھی ہونگی، ان سطروں کے لکھتے وقت اخبار سے معلوم ہوا کہ انکے جنازہ کی نماز ندوۃ العلماء کے احاطہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے پڑھائی، جس میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔ مولانا علی میاں سے تو وہ محبت نہیں بلکہ عشق کرتے، ندوہ سے بھی ان کو غیر معمولی لگاؤ رہا۔ ندوہ میں مولانا علی میاں نے انکے جنازہ کی نماز پڑھا کر اپنا فرض اور قرض دونوں ادا کیا، یہ راقم بخار میں مبتلا تھا اس لئے تعزیت میں نہیں پہونچ سکا لیکن جنازہ کی شرکت کے لئے ایک سہ رکنی وفد دارالمصنفین کی طرف سے بھیجی گیا، دل کے تقاضے سے مجبور ہو کر یہ سطریں بستر علالت ہی پر سے قلمبند کیجا رہی ہیں۔ ؎
"اے نالہ! نشانِ جگر سوختہ کیا ہے"

موت سے کس کو رستگاری ہے
مگر مولانا سپرد خاک ہوئے تو ان کے سینہ میں علم کی جو ہمہ گیری، قلم کی جو جولانی، تحریر کی جو برق وشی، علم و عرفان کی جو فرمانروائی اور اسلام کی عزت و ناموس کی خاطر جو قلمی سرفروشی اور جانبازی تھی وہ بھی ان کے ساتھ تہ خاک ہو گئی، عالم بقا کے مسافر! تجھ پر رحمت، تیری روح پر رحمت، اسلامی روایات کی تیری حدی خوانی پر رحمت، تیرے قلم کی اس کوہ کنی پر رحمت جس سے جوئے شیر اسلامیہ بہتی نظر آتی، الوداع، السلام، تو جا چکا، مگر تو زبان حال سے کہتا گیا ؎
ڈھونڈوگے اگر ملکوں ملکوں،
ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

> نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
> ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں
> (اقبالؒ)

وصیّت نامہ ماجدی

(۱)

پیدائش وسط مارچ (اغلباً ۱۵ مارچ) ۱۸۹۲ء کی بابت شعبان ۱۳۰۹ھ۔ وصیت نامہ لکھ ڈالنے کا خیال مئی ۱۹۵۲ء مطابق شعبان ۱۳۷۱ھ میں پیدا ہوا۔ چنانچہ خوب خیال ہے کہ روتی ہوئی آنکھوں اور کانپتے ہاتھوں سے ایک مسودہ گھسیٹ دیا۔ اس وقت سن ۶۰ سال کا تھا۔ پانچ سال بعد لعدم کر کے فروری ۱۹۵۷ء (رجب ۱۳۷۶ھ) میں دوسرا قلم بند کر دیا۔ عمر نے طوالت کھینچی بار نظر ثانی اور ترمیم کے بعد نوبت ۲ مئی ۱۹۶۰ء کو لکھنے کی آئی۔ یہ مسودہ بھی فرسودہ ہو گیا۔ آج ۶ ستمبر ۱۹۷۲ء (۲۷ رجب ۱۳۹۲ھ) کو یہ مسودہ چوتھی بار لکھ رہا ہوں۔ یعنی عمر کے اسّی ویں سال میں ہوں بحساب سال شمسی۔

بھائی صاحب نے دسمبر ۱۹۶۰ء میں دفعتہً انتقال کیا۔ دل توڑ دینے والا صدمہ کیا کم تھا کہ محبوب بیوی شروع جنوری ۱۹۶۹ء میں اپنے پیچھے پانڈے یہیں دفعتہً سفر آخرت پر روانہ ہو گئیں۔ اس نے تو مجھ کو بالکل ہی بجھا دیا۔ چنانچہ آج جس ان کے بعد سے ہونٹوں پر ہنسی آئی ہے اور اب امید اور انتظار اس کا رہتا ہے کہ دیکھئے کب اس مرحومہ کا دیدار نصیب ہوتا ہے۔

(۲)

جنازہ پڑھانے کے لئے اولاً مولانا علی میاں ندوی کو رکھتا ہوں نہ ملیں تو مولانا فارقلیط[1] (ایڈیٹر الجمعیۃ) مولانا محمد اویس ندوی نگرامی ورنہ پھر کسی صالح مسلم کو سہی۔ دریاباد والوں میں حافظ غلام نبی بھی اچھے ہیں۔ مدفن کے لئے اصلی تمنا یہ تھی (حرمین شریفین کے بعد) جگہ کسی مسجد کے عین دہلیز کے نیچے ملتی۔ بلا علامت قبر کے گویا زمین دوز تاکہ نمازی اس کے اوپر سے گزرتے رہتے لیکن اس تمنا کا پورا ہونا مشکل ہی ہے اس لئے دو تین جگہ تجویز کیے دیتا ہوں (۱) والدہ ماجدہ کے قبر کے پائینتی مگر وہاں جگہ اب کہاں ہے۔ (۲) اپنے مکان سے متصل حضرت مخدوم محمد آبکشؒ کی درگاہ کے اندر اپنے احاطہ کی دیوار سے متصل (۳) اس پرانے قبرستان جو میاں نسیم نعمانی کے مکان سے متصل ہے انہیں کی دیوار سے لگ کر قبر پختہ نہ ہو تو بہتر ہے۔ بارش وغیرہ سے حفاظت کے لئے ٹین کی چادریں ڈالی جاسکتی ہیں۔

قبر پر نام کے بجائے صرف "ایک کلمہ گو" ہو تو بہتر ہے اور بطور کتبہ یہ آئتیں کندہ کی جائیں۔ (۱) وربک الغفور ذوالرحمۃ (۲) قل یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسہم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً انہ ھو الغفور الرحیم

اپنے مخلصین سے طمع اسی کی رکھتا ہوں کہ دعائے مغفرت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں اگر ہر روز تین بار سورۂ اخلاص کا معمول بنایا جا سکے تو سبحان اللہ۔ صالحین خصوصاً مولانا محمد زکریا صاحب (سہارنپور) مولانا محمد طیب صاحب دیوبند اور مولانا فارقلیط صاحب (اگر زندہ رہے) سے دعائے مغفرت ضرور کرائی جائے۔

اتفاق سے اگر وقت موعود وطن سے باہر کہیں آجائے تو وہاں سے لاش لانے کی زحمت وطوالت خواہ مخواہ نہ گوارا فرمائی جائے۔

(نمبر ۳ کا تعلق خانگی امور سے ہے اس لئے اس کو یہاں حذف کیا جاتا ہے)۔

(۴)

دل میں آرزوئیں ہزاروں ہیں اور حسرتیں بے شمار۔ اتنا اعتراف تو مجھ ناشکرے کو بھی کرنا ہی ہوگا کہ اللہ نے اس عمر تک اپنے ہر طرح کے لطف و کرم سے نوازے رکھا اور ہر قسم کی نعمت سے سرفرازی دنیا میں اپنے استحقاق و قابلیت سے کہیں بڑھ کر، اپنے کمال ستاری سے خلق میں رسوا ہونے سے بچائے رکھا آخرت میں تو یہ صفت ستاری کہیں بڑھ چڑھ کر ہو گی وہاں کیسے اپنے فضل و کرم سے محروم رکھیگا سارا بھروسا، سارا ناز، سارا اعتماد بس ایک ذات پر ہے جس نے اپنا نام العفو بھی بتایا ہے اور الغفور بھی، اور الغفار بھی، اور جس نے بے شمار شہادتیں بھی اس کی اپنے پیارے رسولؐ کے ذریعہ امت تک پہونچا دی ہیں۔ ورنہ اپنے اصل حال کے لحاظ سے تو جی بے اختیار یہی چاہتا ہے کہ زمین پھٹے اور اس میں سما جاؤں اور مخلوق میں سے کسی کو اپنا چہرہ نہ دکھاؤں اتنے دن جیا اور نہ حقوق اللہ کی ادائی کی توفیق ہوئی اور نہ حقوق العباد کی۔

عزیزو، مخلصو، رفیقو، بس اللہ حافظ۔ یغفر اللہ لنا ولکم انشاء اللہ العزیز ملاقات جس میں کسی قسم کا خلل نہیں پڑے گا۔ اب جنت ہی میں ہو گی۔

---

[1] مولانا محمد عثمان فارقلیط ہوش شاہ میں مرحوم ہو چکے ہے یہ بھی چند ہی ماہ قبل سفر آخرت پر روانہ ہو چکے۔